Regd. L. No.7243 Phone.80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1976

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان
اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی
قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۱۱
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان ——— ۱۸ روپے
غیر ممالک ——— ۲ پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۱½
ڈیڑھ روپیہ

جلد ۲۹ — ستمبر ۱۹۷۶ء — شمارہ ۹

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) حقائق و عبر ——— ۱۱
(۱) قرآن کریم کے خلاف سازش
(۲) فرقہ بندی اور مودودی صاحب
(۳) طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء ——— ۱۶
(۴) یادوں کے چراغ ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۱۷
(۵) نقد و نظر ——— ۴۲
(۶) باب المراسلات ——— ۴۶
(۷) عورتوں کے حقوق ——— ۴۹

مدیر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا!

قوس قزح کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب بادلوں کے قطراتِ اشک، سورج کی سنہری کرنوں میں سے گزرتے ہیں تو ہفت رنگ پیکر اختیار کرلیتے ہیں جو غم اور مسرت کے امتزاج کا مظہر ہوتا ہے — ہماری ملّی تاریخ میں ستمبر کا مہینہ کچھ اسی انداز سے نمودار ہوتا ہے۔ ہمارے غم کے آنسو ہوتے ہیں، ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی یاد میں جب ہم سے وہ محسنِ ملّت ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا جس نے ہمیں ایسی عظیم مملکت کا وارث بنا دیا، اور جو ایسے وقت داغِ مفارقت دے گیا جب اس کی ہمیں اشد ضرورت تھی۔ اور ہمارے فخر و مسرت کی سنہری کرنیں ہوتی ہیں، جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ان شہدائے اسلام اور غازیانِ ملّت کے محیرالعقول کارناموں کی یادیں، جن کی مثال دنیا کی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے۔ طلوعِ اسلام ان ہر دو واقعات کی یاد تازہ رکھنا اپنا ملّی فریضہ سمجھتا ہے، اس لئے وہ گاہے گاہے ان داغہائے سینہ کو اپنے اوراق میں نمایاں کرتا رہتا ہے۔ جہاں تک' جنگِ ستمبر کا تعلق ہے، وہ اپنی حالیہ اشاعت میں، پرویز صاحب کا وہ خطاب دہرا رہا ہے جس کا ایک ایک لفظ اس داستانِ رنگیں کا رجز خواں ہے۔ اور جہاں تک ۱۱ ستمبر کا تعلق ہے، زیرِ نظر لمعات، بارِ دگر، اسی کی بارگاہ میں بطور خراجِ عقیدت پیش کئے جاتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے، مردِ مومن کی بنیادی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ: ؎

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ اُو جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں
بر کَنَد بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را
می کند از قوتِ خود آشکار — روزگارِ نو کہ باشد سازگار

آج ۱۱ ستمبر ہے جس کی صبح، از خود ہمارے ذہن میں اس مردِ خوددار و پختہ کار کی حسین یاد بیدار

کر دیتی ہے جس نے جب دیکھا کہ زمانہ اُس ملّت کے سازگار نہیں جس کا وہ ایک قابلِ فخر فرزند ہے، تو اس نے اپنے یقینِ محکم، عملِ پیہم، بلندیٔ کردار اور پاکیزگیٔ سیرت سے، زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیا، اور اس جہانِ ناسازگار کی بنیادوں تک کو اکھیڑ کر اس کی جگہ ایک ایسی دنیا کی بنیاد رکھ دی، جو اس ملّت کی مقدّس آرزوؤں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ کس قدر عظیم تھا یہ انسان۔ کیسا بلند مرتبت تھا یہ مردِ مومن۔ اور کیسے درخشندہ تھے اس کے کارنامے۔ جب ہم ایک طرف اپنی تہی دامانی پر نگہ ڈالتے ہیں اور دوسری طرف، اس قسم کے گوہرِ تابدار کی نمود پر، تو بلا ساختہ زبان پر آ جاتا ہے کہ ؎

تو بہارِ عالمِ دیگری، ز کجا بایں چمن آمدی ؟

انہی جیسے انسانوں کی زندگی، وہ زندگی ہے جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ "فطرت ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوئی" اور انہی کی موت وہ موت ہے جس پر نچھاور ہونے کے لئے ہزاروں زندگیاں ہمہ تن انتظار ہوتی ہیں۔ طوبیٰ لہم وحسن مآب۔

اس میں شبہ نہیں کہ قائدِاعظمؒ سے پہلے، ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے بہت سے مایۂ ناز فرزندوں نے حصولِ آزادی کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کی اور بے مثال قربانیوں کی یاد چھوڑی۔ ان سب کی عزت اور احترام ہمارے دل میں ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی جدوجہد کا منتہیٰ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم سے نجات دلانا، یا زیادہ سے زیادہ، ملک کو غیر ملکی فرمانرواؤں کی حکومت سے آزاد کرانا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے لئے ایک آزاد، اسلامی مملکت کا قیام، ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اس وقت (اس موضوع کے متعلق) تاریخی تفصیلات میں جانے کا موقعہ نہیں، اس لئے ہم صرف چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ (مثلاً) علمائے دیوبند کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ آزادی کی جنگ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ لیکن آزادی سے ان کا مقصود، وطن (یعنی ہندوستان) کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ اور بس۔ ۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ (مشہور قومیت پرست) اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل کی اشاعت میں، اسرار احمد آزاد صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس کی سرخیاں حسبِ ذیل تھیں۔

علمائے اسلام اور دارالعلوم دیوبند کا جنگِ آزادی میں حصّہ۔

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں "سلطنتِ اسلامیہ" کے لئے کوشاں رہے۔

اس مقالہ میں، بڑی شرح و بسط سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ علمائے دیوبند کے پیشِ نظر کبھی بھی یہ مقصد نہیں رہا کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کی جائے۔ ان کے پیشِ نظر ہمیشہ جمہوری انداز کی سیکولر حکومت کا قیام رہا۔ اس سلسلہ میں صاحبِ مقالہ نے لکھا تھا۔

دارالعلوم دیوبند کے ساتھ تعلق رکھنے والے علماء نے آزاد ہندوستان کی جو پہلی جماعت

> حکومت کابل میں قائم کی تھی۔ اس کا صدر راجہ مہندر پرتاب کو مقرر کیا تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد، پچاس سال کی مدت میں حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے ماتحت دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ جب اقبالؒ نے، مسلمانانِ ہند کے لئے ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصوّر پیش کیا اور قائداعظمؒ نے اس تصوّر کو محسوس پیکر عطا کرنے کے لئے مجاہدانہ قدم اٹھایا، تو ان علماءؒ نے (بجز معدودے چند جنہیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے) مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کے سامنے صدیوں سے مملکت کا تصور ہی سیکولر رہا ہے —— یعنی امورِ مملکت بادشاہ کے سپرد، اور عقائد و عبادات (یا زیادہ سے زیادہ) شخصی قوانین، علماء کی تحویل میں۔ یہ علامہ اقبالؒ تھے جنہوں نے ہمیں سب سے پہلے یہ تصور دیا کہ:۔

(۱) مسلمان، اپنے دین کی بنا پر، تمام غیر مسلموں سے الگ، ایک منفرد قوم ہیں۔ اور

(۲) اسلامی زندگی صرف اسی صورت میں بسر ہو سکتی ہے جب مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت ہو جس میں وہ قوانینِ خداوندی نافذ کر سکیں۔

تحریکِ پاکستان کی جنگ، درحقیقت، اسلام کے متعلق ان دو (باہمدگر متضاد) تصوّرات کی جنگ تھی —— سیکولر اسلام کا تصوّر جس کے علمبردار علماء حضرات تھے، اور قرآنی مملکت کا تصور جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جسے ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے قائداعظمؒ میدان میں آئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی آزاد مملکت کے قیام کے لئے، ہندی سیاست میں پہلا قدم، انگریز کی غلامی سے آزادی تھی۔ لیکن علماء کے نزدیک یہی منزلِ مقصود تھی، اور تحریکِ پاکستان کے علمبرداروں کے نزدیک، یہ، منزل تک پہنچنے کا پہلا قدم تھا —— ان ہر دو تصورات کی جنگ کا نمایاں ترین، اور شدید ترین مظاہرہ، علامہ اقبالؒ اور (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کا وہ تصادم تھا جسے (بجا طور پر) "معرکۂ دین و وطن" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس معرکہ میں جب، (مولانا) مدنی نے کہا کہ جنگِ آزادی سے مقصود، وطن کو انگریزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، تو علامہ اقبالؒ نے (یوں کہئے کہ بسترِ مرگ سے) یہ جواب دیا کہ:۔

> مسلمان ہونے کی حیثیت سے، انگریزی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل

> کو مٹا کر دوسری جگہ دیا تو ایسی پاکستان کو قائم کرنا چہ معنی دارد۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کو علماء حضرات کی ان تصریحات سے اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بستر سے اٹھ ہی نہ سکے، اور اسی عالمِ آزادی کو قائداعظمؒ کے سپرد کر کے خود ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ آپ کے بعد، قائداعظمؒ نے یہ تحریک اپنے ہاتھ میں لی اور اس کے لئے جنگ لڑی — جس میں، ان کے مدمقابل انگریز اور ہندو کے علاوہ، قوم پرست مسلمان علماء، مجلس احرار، سرخ پوش، یلغار، جماعت اسلامی سب شامل تھے۔ تو اسی مقصد کے حصول کے لئے۔ یعنی ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جس میں مسلمان، خدا کے احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے۔ انہوں نے (جون ۱۹۴۵ء میں) فرنٹیئر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں، علامہ اقبالؒ کے مندرجہ صدر بیان کو ان الفاظ میں دہرایا کہ:۔

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، ہم نے اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

انہوں نے ہندوؤں، انگریزوں اور ان کے ساتھ فریب خوردہ اور فریب دہندہ علماء کو بار بار سمجھایا کہ اسلام ایک مذہب نہیں جسے ہر قسم کی حکومت میں آزادی حاصل ہو سکتی ہے۔ اسلام، دین ہے۔ جو اپنی آزادی کے لئے آزاد مملکت کا متقاضی ہے۔ انہوں نے (۲۴ نومبر ۱۹۴۵ء کو) ایڈورڈز کالج

۱؎ جماعتِ اسلامی والے کہتے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس لئے کی تھی کہ اس تحریک سے مقصود صرف مسلمانوں کی انگریزوں کی غلامی سے آزادی تھی اور مودودی صاحب ایسی آزادی کے طالب تھے جس میں اسلام بھی آزاد ہو۔ ہم ان حضرات سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس شہرۂ آفاق بیان سے (جو جنوری ۱۹۳۸ء میں دیا گیا تھا اور جس نے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا) پٹھانکوٹ میں بیٹھے ہوئے مودودی صاحب کو اتنا بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ تحریکِ پاکستان سے کس قسم کی آزادی مقصود تھی؟

پشاور، میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

> ہم دونوں قوموں (ہندوؤں اور مسلمانوں) میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے۔ جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

قائداعظمؒ کے ارشادات میں سے ہم اس موضوع پر متعدد دیگر اقتباسات پیش کر سکتے تھے۔ لیکن ہم اس کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ ہم انہیں بہ اصرار و تکرار پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت ہم صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی اس قدر واضح تصریحات کی موجودگی میں، پاکستان کے ازلی دشمن، مودودی صاحب، مسلمانوں کو یہ کہہ کر بہکاتے (یا اپنے عقیدت مندوں کو فریب دینے کی کوشش کیا کرتے) تھے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے یہ نہیں کہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ، یہ کچھ کہتے ہی بھی کوئی جھجک یا ندامت محسوس نہیں کیا کرتے تھے کہ:-

> افسوس، کہ لیگ کے قائداعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ (ترجمان القرآن - ذی الحجۃ ۱۳۵۹ھ)

قائداعظمؒ نے پاکستان کا یہ مطلب و مقصد، تحریکِ پاکستان کے دوران ہی نہیں بتایا۔ انہوں نے حصولِ پاکستان کے بعد، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں، خالق دینا ہال کراچی میں، حکومت کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام، جس کے لئے ہم گذشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشو و نما پا سکیں، اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی (سوشل جسٹس) کے اصول آزادانہ طور پر روبعمل لائے جا سکیں۔

قائداعظمؒ کو شروع ہی سے اس کا علم و احساس تھا کہ شیر شکار مارتا ہے اور اس کے بعد، گیدڑ اور کرگس اسے کھانے کے لئے لپک پڑتے ہیں۔ وہ پاکستان کو ان گیدڑوں اور کرگسوں سے بچانا چاہتے تھے، جنہیں ——— (۱) سرمایہ داری کے خون آشام، اور

(۲) تھیاکریسی کے اقتدار پسند، یعنی مذہب کی آڑ میں حکومت پر قابض ہونے کے آرزو مند

کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ، ساری عمر ان دونوں اسلام دشمن قوتوں کے خلاف مصروفِ جہاد رہے۔ (طلوعِ اسلام کے صفحات پر اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے)۔ نظامِ سرمایہ داری کے سلسلہ میں، انہوں نے ۱۹۳۱ء میں فرانسس ینگ ہسبنڈ سے جو کچھ کہا تھا اس کا ملخص یہ تھا کہ بالشویت کے معاشی نظام کو اگر قرآنی فلسفۂ زندگی کی بنیادوں پر استوار کر دیا جائے تو وہ، اسلام کے معاشی نظام کے مماثل سکتا ہے۔ یہی ان کے نزدیک، اسلامی مملکت کا معاشی نظام ہونا چاہئے۔ اسی نظام کو "سوشل ڈیماکریسی" کے نام سے تعبیر کر کے انہوں نے ۱۹۳۷ء میں قائداعظمؒ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:۔

> اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش بطورِ حق مل جاتا ہے۔ اگر ہندومت نے سوشل ڈیماکریسی کو اپنے اں قبول کر لیا تو ہندومت کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کو ایسے انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے نہ ٹکرائے، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں ہوگا بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے اس منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں جیسا کہ وہ صدرِ اوّل میں تھا۔

قائداعظمؒ نے اسلامی نظام کی اس روح کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۴۳ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کے سیشن میں برملا اعلان کیا کہ:۔

> اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا چسکا ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے...... میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے مقصود یہی ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

جہاں تک تھیاکریسی کا تعلق ہے، انہوں نے فروری ۱۹۴۸ء میں، اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کیا تھا جس میں کہا تھا کہ:۔

> آئینِ پاکستان مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے

ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

مسلمانانِ ہند کی یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ انہیں، ایسے وقت میں جب ان کا مستقبل اس قدر تاریک ہو رہا تھا، اس قسم کا رہبرِ فرزانہ مل گیا جس نے انہیں ایک عظیم مملکت کا مالک بنا دیا، وہاں ملتِ پاکستانیہ کی انتہائی بدقسمتی تھی کہ وہ رہبرِ فرزانہ اس مملکت کو اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھالنے سے پہلے ہی ان سے جدا ہو گیا اور اس کے بعد، اس شیرِ نیستاں کے مارے ہوئے شکار پر، گیدڑوں اور کرگسوں نے یلغار کر دی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے تحریکِ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی، یہاں سب سے زیادہ معتبر بنے ہوئے ہیں اور سیکولر نظام اور تھیاکریسی کے علمبردار جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس مملکت کا وجود عمل میں آیا تھا، مملکت پر مسلط ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ قرآن جس کی حکمرانی کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا، ان کا نام لینے والوں کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے جاتے ہیں۔ عوام میں جس قدر عدم سکون اور فقدانِ اطمینان پایا جاتا ہے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جس مذہب گریزی اور سرکشی و متشددانہ عصریت کا جنون ابھر رہا ہے، اس کے غبار کے اسباب یہی دو ہیں۔ یعنی سیکولر نظام کی حمایت اور مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلام کا غلط تصور۔ اور انہی کے ہاتھوں ملک تباہ ہو رہا ہے۔

ایک طرف یہاں اس قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف کیفیت وہ ہے جسے کبھی اقبالؒ نے ایک آہِ سحرگاہی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

جوں جوں حالات ناسازگار ہوتے جاتے ہیں، قائدِ اعظمؒ کی عظمت اور اجاگر ہوتی جاتی ہے کہ انہوں نے جس بھنور سے کشتیٔ ملت کو صحیح و سلامت نکال کر کنارے تک پہنچایا تھا، وہ بڑے بڑے بلاخیز طوفانوں سے کہیں زیادہ تباہ کن اور ہیبت ناک تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ۱۱ ستمبر کو ملت کے اس عظیم محسن کی کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس ہو رہی ہے۔ ملت کا وہ عظیم محسن، جس کی وفات پر دوست اور دشمن سب نے خراجِ تحسین پیش کیا، دنیا کے سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار، لنڈن ٹائمز، نے لکھا تھا۔

قائدِ اعظمؒ نے اپنے آپ کا ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں نہ ذہنی لچک تھی جو انگریز کے نزدیک چند دستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو اپنا ہدف بناتے تھے اس پر سیدھا راستہ

نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ تسخیر حریف تھے۔

امریکہ کے سابق صدر، مسٹر ٹرومین نے کہا تھا۔

> دولتِ پاکستان کا معمار۔ دنیا کی سب سے بڑی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد، حکومتِ پاکستان اور اس کے عوام کیلئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

مسز سروجنی نائیڈو نے قائداعظمؒ کے چرنوں میں، ان ناقابلِ فراموش الفاظ میں اپنی شردھا کے پھول بکھیرے تھے۔

> میں قائداعظمؒ کے متعلق، وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا تھا۔

"شہادت" ہمارے ہاں ایک مذہبی اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ لیکن اگر اس کا اطلاق کسی ایسے شخص کی موت پر بھی کیا جا سکتا ہے جو ایک مقدس نصب العین کے حصول کی خاطر، کسی خطرہ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، بالارادہ اپنی جان قربان کر دے، تو (جو راز حال ہی میں بے نقاب ہوا ہے، اس کے پیشِ نظر) قائداعظمؒ کی موت یقیناً "شہادت" کہلانے کی مستحق قرار پا سکتی ہے۔

حال ہی میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ (FREEDOM AT MIDNIGHT) اس میں، ہندوستان کے اس آخری وائسرائے (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کی ذاتی ڈائری کے اقتباسات درج ہیں جس نے (بادلِ صد ناخواستہ، اور قائداعظمؒ کے بقول مجبور ہو کر) تقسیمِ ہند کی دستاویز پر دستخط کئے تھے۔ ہوا یوں کہ قائداعظمؒ نے جنگِ آزادی کے اواخر میں، اپنی تیزی سے گرتی ہوئی صحت کے متعلق اپنے ذاتی معالج (بمبئی کے ایک نامور پارسی ڈاکٹر) سے مشورہ کیا۔ اس نے ان کا "ایکس رے" لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے اس قدر "دق آلود" ہو چکے ہیں کہ اگر آپ نے ہر قسم کی جدوجہد سے کنارہ کشی کر کے یکسر آرام اور سکون کی زندگی اختیار نہ کی، تو آپ دو تین سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائداعظمؒ نے کیا کہا؟

انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس "ایکس رے" کو کسی کے سامنے آنا چاہئیے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ وہ "ایکس رے" بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض دونوں کے لب بھی سربمہر۔ یہ راز قائداعظمؒ کی زندگی میں کسی پر افشا نہ ہوا۔ قائداعظمؒ نے ایک دن بھی آرام سے بسر نہ کیا اور اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر، مسلسل اور پیہم مصروفِ نبرد آزمائی رہے۔ سنئیے کہ اس راز سے، مذکورہ بالا کتاب میں کس انداز سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

> اگر ماؤنٹ بیٹن۔ جواہر لال نہرو، یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں ایک

غیرمعمولی راز سے واقف ہوجاتے تو تقسیم ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔ یہ راز ایک بھورے رنگ کی فلم میں پوشیدہ تھا —— یعنی دو انسانی پھیپھڑوں کے ایکس رے ہیں جنہیں تپ دق کے جراثیم نے چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔ یہ مرض اس حد تک آگے بڑھ چکا تھا کہ یہ مریض دو تین سال سے زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ ایکس رے، ایک سادہ لفافہ کے اندر ملفوف، بمبئی کے ایک ڈاکٹر کے دفتر میں سربمہر محفوظ رکھا تھا —— اور یہ پھیپھڑے، اس متصلب اور بے لچک انسان کے تھے جس نے، ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے، مونٹ بیٹن کی تمام کوششوں پر پانی پھیر دیا تھا۔

کہئے، کہ ان حالات میں، حصولِ مقصد کی خاطر جان دے دینے والا، اور وہ بھی پروانے کی طرح خاموش (کہ اس راز کو، قائداعظمؒ نے اور تو اور، اپنی نہایت معتمد علیہ بہن تک سے بھی چھپائے رکھا) "شہید" نہیں کہلائے گا تو اور کس لقب سے یاد کیا جائے گا!

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لیکن اسی محسنِ ملت کی حاصل کردہ مملکت میں، پناہ لینے والوں میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس نے (اس عظیم ہستی کی وفات سے دو تین ماہ قبل) اس کے محیر العقول کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی۔

(مودودی صاحب۔ بحوالہ ترجمان القرآن۔ بابت جون ۱۹۴۸ء)

سچ ہے —— شکستِ پندار انسان کو پاگل کر دیتی ہے —— ۱۱ ستمبر کی یاد سے ہمارے یہ زخم بھی از سرِنو ہرے ہو جاتے ہیں۔

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی خط یا ڈاک ٹکٹ ساتھ بھیجئے ورنہ تعمیل نہ ہوگی۔

(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ تک دے دیں۔ اس کے بعد اطلاع آنے پر پرچہ قیمتاً (بشرطِ موجودگی) بھیجا جائے گا۔

(۳) جملہ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام کے نام کی جائے۔ خط و کتابت میں اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولئے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

حقائق و عبر!

۱۔ قرآنِ کریم کے خلاف سازش

طلوعِ اسلام بابت فروری ۱۹۷۶ء میں ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا —— اب قرآن کی باری آئی —— اس میں بتایا گیا تھا کہ مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ قرآنِ کریم سات زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے ان میں سے چھ زبانوں کی قرأتوں کو منسوخ قرار دے کر، صرف ایک زبان کو باقی رکھا۔

حالانکہ انہیں منسوخ کرنے کا حکم نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا، نہ رسولِ اکرمؐ کی زبانِ مبارک سے سنا گیا۔

ہم نے لکھا تھا کہ اس قسم کے خیالات پھیلانا، قرآنِ کریم کے خلاف سنگین سازش ہے اور لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی نہایت مذموم کوشش۔

کراچی سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا ہے —— البلاغ —— وہ دارالعلوم کراچی کا ترجمان ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب اس کے سرپرست، اور ان کے صاحبزادہ، محمد تقی عثمانی صاحب اس کے مدیر ہیں۔ اس کی اشاعت بابت مئی ۱۹۷۶ء کے ایک مقالہ میں (جو بالاقساط شائع ہو رہا ہے) اس کی تفصیل بتائی گئی ہے کہ قرآن مجید سات زبانوں میں کس طرح نازل ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ، بنو غفار کے تالاب کے پاس تھے کہ:-

> جبرائیل حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ کی (ساری) اُمت قرآنِ کریم کو ایک ہی حرف پر پڑھے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں اور میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے۔ پھر جبرائیل علیہ السلام دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کریم کو دو حرفوں پر پڑھے۔ آپؐ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت چاہتا ہوں۔ میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے، پھر وہ تیسری بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآنِ کریم کو تین حروف پر پڑھے۔ آپ نے

پھر فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں۔ میری اُمت میں اس کی طاقت نہیں ہے۔ پھر وہ چوتھی بار آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ کی اُمت قرآن کو سات حروف پر پڑھے، پس وہ جس حرف پر بھی پڑھیں گے ان کی قرأت درست ہوگی۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ "بعض دوسرے علماء مثلاً حافظ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے فرمایا کہ مذکورہ حدیث میں سات حروف سے مراد قبائل عرب کی سات لغات ہیں۔"

یہ تھیں وہ سات زبانیں جن میں (مذکورہ بالا حدیث کی رُو سے) حضورؐ نے درخواست پر درخواست گذران کر، قرآن مجید نازل کرایا تھا اور جن میں سے (بقول مودودی صاحب) چھ کو حضرت عثمانؓ نے (خدا اور رسولؐ کے حکم کے بغیر) منسوخ قرار دے کر، صرف ایک زبان کو باقی رکھا۔

فرمایئے! اگر اسے قرآن مجید (بلکہ اسلام) کے خلاف منظم سازش نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا؟ وہ سازش جس کا آغاز جھوٹی روایات وضع کرنے سے ہوا، اور جسے ہمارے "علمائے کرامؒ اور اقامتِ دین کے مدعیان" پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اور اسی قسم کی ہیں وہ روایات جنہیں وضعی کہنے سے طلوعِ اسلام پر "منکرِ حدیث" کا لیبل لگایا جاتا ہے۔!

۲۔ فرقہ بندی اور مودودی صاحب

ایشیا بابت ۴ جولائی ۱۹۷۶ء میں، مودودی صاحب کی شام کی ایک مجلس کی روئداد شائع ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

خوشاب کے ایک صاحب نے کہا۔ مولانا! کیا فرقہ بندی اسلام میں جائز ہے؟

مولانا نے فرمایا:۔ سخت ناپسندیدہ ہے۔ گناہِ عظیم ہے، قرآنِ پاک میں آیا ہے۔ اے مسلمانو! گروہوں اور فرقوں میں نہ بٹو: اور روشن دلائل آنے کے بعد اختلاف نہ کرو، لیکن اس واضح ممانعت کے باوجود مسلمان علماء اور عوام مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، مسجدیں اور نمازیں تک الگ ہوگئی ہیں۔ فقہی مسائل میں اختلاف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بھی تھا، لیکن اس اختلاف نے انہیں ایک دوسرے سے پھاڑا نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد، خیرخواہ اور رفیق تھے، اکٹھے نمازیں پڑھتے تھے اور مسجدیں بھی سب کی ایک ہی تھیں، لیکن اب تو فرقہ بندی کی وبا سے کوئی گوشہ محفوظ نہیں ہے۔

ایک نوجوان نے سوال کیا۔ مولانا! جماعتِ اسلامی فرقہ بندی کو ختم کرنے کی

جانب توجہ کیوں نہیں دیتی!

مولانا نے فرمایا - جماعتِ اسلامی کا سارا لٹریچر ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک دین، اور ایک ملت کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے، جماعتِ اسلامی بنائی ہی اسی لئے گئی تھی کہ تمام مسلمان اختلافات کے باوجود جمع ہو کر اسلامی نظام کے قیام کے لئے جدوجہد کریں، لیکن شیطان ہمارے مقابلے میں مسلمانوں کو فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کرنے اور ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے میں لگا ہوا ہے۔ اس کے لاکھوں کروڑوں چیلے چانٹے خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔ ہم اتنی قوت نہیں رکھتے کہ شیطان کو اس کے عہدے سے معزول کرکے اس کے کام کو بند کر سکیں۔ شیطان نہ صرف لوگوں کو انفرادی طور پر گمراہ کرتا ہے بلکہ وہ اپنی جمعیت کو اس پر بھی تیار کرتا ہے کہ وہ اجتماعی طاقت اور حکومت کے امور پر قبضہ کرکے خدا کے بندوں پر شیطانی قانون نافذ اور برائی کو نیکی پر غالب کریں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اپنی دعوت کو اسی محنت اور تیاری کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ جو بھی حق شناس اور سلیم الفطرت لوگ ہوں گے وہ ہماری دعوت پر ضرور لبیک کہیں گے اور وہ اس کی کوشش بھی کریں گے کہ اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر جو لوگ دنیا میں ظلم و ستم اور باغیانہ قانون چلا رہے ہیں۔ ان سے اقتدار چھین کر شیطان کے قانون کو ختم کرائیں تاکہ خدا کے بندوں پر پھر سے خدا کا قانون جاری ہو جائے۔

غنیمت ہے کہ مودودی صاحب نے ان فرقوں کو "فرقے" کہہ کر حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے، ورنہ ابلیسی افسوں سازی نے انہیں "مکاتبِ فکر" قرار دے کر مذہبی پیشوائیت کے لئے ابلہ فریبی کا نہایت مؤثر حربہ مہیا کر دیا ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے فرقہ بندی کو "سخت ناپسندیدہ اور گناہِ عظیم" ہی کہا ہے حالانکہ قرآنِ مجید نے اسے بہ نصِ صریح شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۲)

مودودی صاحب نے کہا ہے کہ "جماعتِ اسلامی کا سارا لٹریچر ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک دین اور ایک ملت کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے"۔ یہ بہت بڑی مغالطہ آفرینی ہے۔ فرقے صرف "وحدتِ قانون" کی رُو سے مٹ سکتے ہیں۔ یعنی تمام مسلمانوں کے لئے ایک ضابطۂ قوانین۔ اس کے برعکس، جماعتِ اسلامی کا مطالبہ یہ ہے کہ مملکتِ پاکستان میں:-

(۱) پرسنل لاز (شخصی قوانین) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں۔ اور

(۲) پبلک لاز کے لئے حنفی فقہ رائج کر دی جائے۔ (مودودی صاحب کی اس تجویز کے خلاف غیر حنفی فرقوں نے طوفان برپا کر رکھا تھا)۔

ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جماعتِ اسلامی کے اس مسلک اور مطالبہ کی رُو سے، فرقے مٹ جائیں گے یا اُن کی

گرہیں اور مضبوط ہو جائیں گی؟

مودودی صاحب نے کہا ہے کہ کوشش یہ کرنی چاہئیے کہ :-

> اجتماعی طاقت کے بل بوتے پر جو لوگ دنیا میں ظلم و ستم اور باغیانہ قانون چلا رہے ہیں، ان سے اقتدار چھین کر شیطان کے قانون کو ختم کرائیں تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کا قانون جاری ہو جائے۔

(ائمہ احناف یا دیگر فقہا کے احترام کے باوجود) ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فقہ حنفی کو، جسے آپ مملکت کا قانون قرار دینے کی تجویز کرتے ہیں، "خدا کا قانون" قرار دیا جا سکتا ہے؟ دوسرے فرقوں کو تو چھوڑیئے کہ وہ فقہ حنفی کو اسلامی شریعت ماننے کے لئے بھی تیار نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، خود حنفی حضرات بھی اپنی فقہ کو "خدا کا قانون" قرار نہیں دیتے۔ وہ اسے کتاب و سنت کی روشنی میں ائمہ فقہ کا اجتہاد ہی قرار دیتے ہیں، خواہ اس اجتہاد کو وہ قابلِ تغیر ہی کیوں نہ سمجھیں۔

دوسرے تو ایک طرف رہے، ہم مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ خود اس فقہ کو "خدا کا قانون" سمجھتے ہیں؟ خدا کے قانون کی بنیادی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متغیر ہوتا ہے۔ (۶/۳۴) لیکن فقہ اور ائمہ فقہ کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ :-

(۱) مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو، زمان امکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات - حصہ دوم - ص ۲۲۶ - ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

(۲) یہ "سلف" کوئی انبیاء تھے، جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے (ایضاً - ص ۱۳۷)

(۳) بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جا سکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا برد کر دینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل - جلد سوم - ص ۲۸۳ - ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۴ء)

(۴) دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۰ھ - ص ۳۶)

(۵) میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل - حصہ دوم - ص ۱۲۰ - ایڈیشن ستمبر ۱۹۶۳ء)

(۶) میں نہ مسلک اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔ (رسائل و مسائل - حصہ اوّل - ص ۲۳۵ - ایڈیشن ستمبر ۱۹۵۱ء)

(۷) میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (ایضاً ص ۲۴۴)

(۸) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے۔ دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کیلئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات - صلا - پانچواں اڈیشن)

یہ ہیں فقہ کے متعلق خود مودودی صاحب کے نظریات جنہیں وہ خدا کے قانون کی حیثیت سے مملکت کا ضابطہ قوانین قرار دینے کی تجویز کر رہے ہیں! آپ دیکھئے کہ کتنا بڑا دھوکا ہے جو قوم کو دیا جا رہا ہے!

یاد رہے کہ خدا کا قانون، خدا کی کتاب کے اندر ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہے۔ لیکن ایسا کہنے والوں کے پیچھے مودودی صاحب لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ اگرچہ وہ مصلحتاً یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

> تمام زمانی و مکانی قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوندِ عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات - صلا - پانچواں اڈیشن)

لیکن یہ تو مصلحت کے تقاضے ہیں۔ عملاً "خدا کا قانون" وہی ہے جسے مودودی صاحب خدا کا قانون قرار دے دیں۔ یعنی مزاج شناسِ رسولؐ کی نگہ بصیرت کا فیصلہ: یہی ہے وہ قانون جسے نافذ کرنے کے لئے وہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں۔

(ضمناً) ہم اکثر کہا کرتے ہیں کہ مودودی صاحب مذہب کے معاملہ میں (SERIOUS) نہیں ہیں۔ انہوں نے اس لبادہ کو حصولِ مفاد کے ذریعہ اور مشغلہ کے طور پر اوڑھ رکھا ہے۔ دیکھئے! اس کی تصدیق خود ان کے اپنے ہاں سے کس طرح ہوتی ہے۔ اخبار ایشیا کے حوالہ سے جو گفتگو اوپر کی گئی ہے اس میں، مودودی صاحب کی مجلس کی روئداد کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

> مولانا صحن چمن میں اپنی مخصوص آرام کرسی پر تشریف فرما ہیں اور حاضرینِ مجلس خاموشی سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دن بھر کے بھاری بھرکم علمی کام کے بعد مولانا کو بھی تفریح کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اگر مجلس سے کوئی سوال نہیں ہوتا تو مولانا بعض اوقات خود گفتگو چھیڑ دیتے ہیں۔
>
> (ایشیا - ۴ر جولائی ۱۹۷۶ء)

گویا اس مجلس میں، خدا، رسولؐ، دین، شریعت کے متعلق جو گفتگو ہوتی ہے وہ محض تفریحاً ہوتی ہے! ایسے ہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ:-

> وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ... (۶/۷۰)
>
> جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے (کیونکہ) دنیاوی مفاد نے انہیں فریب میں مبتلا کر رکھا ہے، ان سے کنارہ کشی اختیار کرو۔

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن ۱۹۷۶ء

یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

- تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد قرآنی فکر، پیغام، اصول، قوانین و اقدار کا عام کرنا اور یہ واضح کرنا ہے کہ جب کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج ہوگا تو اس کی خصوصیات کیا ہوں گی اور اس کے انسانیت ساز نتائج کس قسم کے۔
- اس مملکت میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہوگا نہ کسی کا محکوم۔ حاکمیت صرف قرآن کریم کی ہوگی اور ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی اس طرح پوری ہوں گی کہ اس کی عزتِ نفس قطعاً مجروح نہ ہونے پائے۔
- اس فکر کی نشر و اشاعت کے ذرائع، پرویز صاحب کی تصانیف، ان کا درسِ قرآن - ان کے خطابات اور مختلف موضوعات پر پمفلٹ وغیرہ ہیں۔

ان کے علاوہ

طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن

- امسال یہ کنونشن ماہِ اکتوبر میں منعقد ہوگی۔ متعین تاریخوں کا اعلان اور پروگرام طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوگا۔
- جو حضرات کنونشن میں مقالات پیش کرنا چاہیں وہ اس امر کی اطلاع (مع موضوع) پندرہ ستمبر تک، فرما دیں، اور مقالہ کا مسوّدہ یکم اکتوبر تک بھیج دیں۔
- مذاکرہ میں شرکت کے متمنی طلبا و طالبات (نیز اساتذہ) اس امر کی اطلاع دس ستمبر تک دے دیں۔ مذاکرہ کے موضوع سے انہیں انفرادی طور پر مطلع کر دیا جائے گا۔
- طلوعِ اسلام کی بزمیں متنبہ رہیں کہ چونکہ وقت بہت کم ہے، اس لئے ادارہ کی طرف سے طلب کردہ معلومات وغیرہ بلا تاخیر بھیجی جائیں۔ متعینہ تاریخوں کے اعلان کا انتظار نہ کیا جائے۔ شکریہ

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور

یادوں کے چراغ

پرویز

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصوّر نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

ہم نے طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۴ء میں لکھا تھا کہ زندہ قومیں اُن دنوں کی یاد ہمیشہ تازہ رکھتی ہیں جب ان کی ملّی تاریخ میں کوئی انقلاب آفریں واقعہ نمود میں آیا ہو۔ یہ یاد ان دنوں کی نہیں ہوتی، بلکہ اُن محسنین کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کی تقریب ہوتی ہے جن کے ہاتھوں وہ انقلاب رونما ہوا تھا۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ آنے والی نسلوں کے دل میں، ان مشاہیر کے نقوشِ قدم پر چلنے کا ولولہ بیدار رہے۔ جب کوئی قوم رو بہ انحطاط ہوتی ہے تو اس کی زندگی کے صفحات سے ان یادوں کے نقوش مدھم پڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یا اگر وہ باقی رہتے ہیں تو محض ممی شدہ لاشوں کی طرح۔ قوموں کی زندگی چونکہ دنوں، مہینوں، برسوں سے نہیں بلکہ صدیوں کے پیمانے سے ماپی جاتی ہے اس لئے ان میں ثبات و محو کا عمل بھی سینکڑوں سالوں کے بعد ظہور میں آتا ہے۔

ہماری ملّی زندگی میں، یومِ پاکستان (۲۳ مارچ) جب قوم نے ایک آزاد مملکت کے حصول کے عزم کا اظہار کیا۔ یومِ آزادی (۱۴ اگست) جب اسے وہ مملکت حاصل ہو گئی، اور ان کے بعد ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء جب اسے، شہدائے پاکستان کے مقدس خون کے صدقہ میں حیاتِ تازہ عطا ہوئی، ایسے عظیم دن تھے جن کی یاد ہمیشہ درخشندہ و تابندہ رہنی چاہیئے تھی۔ لیکن افسوس کہ قوم کے حافظہ سے ان کی یاد کے نقوش ماند پڑنے شروع ہو گئے ہیں —— اور قیامت یہ کہ اس عملِ ویرانگی کی ابتداء صدیوں بعد نہیں، ہماری ملّی عمر کے پہلے ربع صدی میں ہی ہو چکی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس قسم کے طلوع اور رو بہ زوال ہونے کی مثال تاریخ میں کہیں اور بھی مل سکے!

طلوعِ اسلام اپنی بساط کے مطابق ان نقوش کی یاد تازہ رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ان تقاریب پر پرویز صاحب کے خطابات و مقالات کی اشاعت اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔

جہاں تک تحریکِ پاکستان کا تعلق ہے، ان کے خطابات اس عہدِ تدبیں کی درخشندہ تاریخ اپنے اندر سموئے ہوتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اشاعت بار بار کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جنگ ستمبر (۱۹۶۵ء) کی یاد میں، ان کا قلبِ حساس جس شدت سے وقفِ اضطراب ہوتا ہے، اس کا انداز ہی منفرد ہے۔ انہوں نے شہداء پاکستان کی یاد کی تقریب پر ۸ ستمبر ۱۹۶۷ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال (لاہور) میں منعقد ہونے والے اجتماع عام میں ایک برجستہ تقریر کی تھی جسے ٹیپ ریکارڈر اور ازاں بعد طلوع اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔ ہم، اس سال کی اس تقریب پر، اسی کو قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، کہ ہمارے نزدیک، شہدائے پاکستان کی بارگاہ میں اس سے بہتر ہدیۂ عقیدت شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اسے بغور پڑھئے۔ اپنے زخموں کو تازہ کیجئے۔ اور ہمارے ساتھ خون کے آنسو رو دیجئے۔ انہوں نے کہا تھا:

صدر محترم و عزیزانِ گرامی قدر!

جب سے آسمان نے اپنی آنکھ کھولی ہے، اس نے خطۂ ارض کو سلسلۂ روز و شب میں گرفتار پایا ہے۔ ایک معین وقت پر صبح نمودار ہوتی ہے۔ سورج کی کشتی، اسمیں ایک خاص راستہ طے کر کے، شام کے وقت، اُفق کے اس پار، غرقِ بحرِ نیل ہو جاتی ہے۔ اس سے دن کا خاتمہ اور رات کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر دوسری صبح سے اسی دائرہ کا آغاز ازسرِنو ہو جاتا ہے۔ صبح اور شام کا یہ لامتناہی چکر، ازل سے شروع ہے اور ابد تک اسی طرح چلا جائے گا۔ لیکن روز و شب کے اس سلسلۂ دراز میں بعض دن ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا "ایام اللہ" یعنی اللہ کے اپنے دن، کہہ کر پکارتا ہے۔ یوں تو وہ کونسا دن ہے جو اللہ کا نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جن دنوں کو خدا خود اپنے دن کہتا ہے، ان میں کوئی بہت بڑی خصوصیت ہوگی۔ یہ خصوصیت کیا ہے، اس کی تشریح خود قرآن نے اس مقام پر کر دی ہے جہاں حضور نبی اکرمؐ سے کہا گیا ہے کہ:

وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵)

انہیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ۔

ایام اللہ

اور اس کے بعد کہا ہے کہ ان دنوں میں سے ایک دن وہ ہے جب بنی اسرائیل کی مظلوم و مقہور، محکوم و مغلوب قوم کو، فرعون کے جور و استبداد سے نجات دلا کر انہیں ایک آزاد مملکت عطا کر دی گئی تھی۔ لہٰذا "اللہ کے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی عظیم معرکہ برپا ہوا ہو۔ اور اس میں حق کی حمایت کرنے والی قومیں، عدل و انصاف کا پرچم بلند کئے، فاتح و منصور رزم گاہ سے واپس آئیں۔ اسی قسم کا ایک دن، آج سے ٹھیک دو سال پہلے، ہماری تاریخ میں بھی آیا تھا، کہ جس کی یاد ان دنوں ملک کے طول و عرض میں نہایت تزک و احترام سے منائی جا رہی ہے اور جس میں شرکت کے لئے ہم اس وقت یہاں جمع ہوئے ہیں۔ خدا کے اس عظیم دن کی یاد کو ہمیں ماضی کے دھندلکوں میں تلاش نہیں کرنا پڑتا۔ اس

کے لئے نہ ہمیں تاریخ کے کرم خوردہ نوشتوں کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے، نہ وقت کے غبار آلودہ
کھنڈرات کا زیرِ بارِ احسان۔ یہ ہمارا آنکھوں دیکھا ماجرا ہے۔ اس کی چلتی پھرتی تصویریں ہمارے
آئینۂ چشم میں محفوظ، اور اس کے کوائف و مناظر ہمارے لوحِ قلب پر مرتسم ہیں۔ اس کی جزئیات تک
ہمارے ذہنوں میں منقوش، اور اس کے تاثرات ہمارے سینوں میں دل کی دھڑکنیں بن کر مستور
ہیں۔ یوں تو یہ معرکہ پورے کے پورے پاکستان کے لئے ساعتِ قیامت سے کم نہ تھا، لیکن ہم
اہلِ لاہور تو گویا بہ نفسِ نفیس اس عرصۂ محشر میں شریک تھے، اس وقت جب میں، بیم و رجا
کے اُن جانگسل لمحات کو اپنے حافظہ کے ریکارڈ سے چشمِ تصوّر کے سامنے لا رہا ہوں، اُن دھماکوں
کی آواز مسلسل میرے کانوں میں آ رہی ہے جو آج سے دو سال پہلے، ٹھیک اسی وقت، کبھی پیامِ
موت بنتے تھے، کبھی نشۂ حیات۔ یہ وہ وقت جب ہماری عزت و ناموس اور وحشی رہزنوں اور
عفریتی قزاقوں کے درمیان فقط نہر کا ایک چھوٹا سا پُل حائل تھا۔ اس وقت میری آنکھوں کے سامنے
وہ منظر پھر رہا ہے جب واہگہ کی طرف سے آتشیں گولے اُٹھ اُٹھ کر خارجی فضا میں تحرک اور ہماری
داخلی دنیا میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ اُس وقت میرے گرد و پیش کچھ معصوم بچے، غبارے دل
سے کھیل رہے تھے۔ میری نگاہیں کبھی اُن آتشیں گولوں کی طرف اٹھتیں اور کبھی ان ننھے معصوموں
کے مستقبل کی طرف۔ میں ان احساسات کو، جن سے اُس وقت میرا خون منجمد ہو رہا تھا، کیسے بھلا
سکتا ہوں؟ اس سے بھی بڑھ کر وہ منظر کہ اُدھر سے میرے کانوں میں سکھ "سورماؤں" اور
مرہٹہ "بلوانوں" کے پاؤں کی آہٹ آ رہی تھی اور اِدھر میری آنکھوں کے سامنے وہ جوان بیٹیاں
اور بہنیں پھر رہی تھیں جن کے کھلے سر کو آسمان کی آنکھ کے سوا کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ سوچئے
کہ میں ان تاثرات کو کیسے فراموش کر سکتا ہوں! ـــــ نہیں! اس سے ایک قدم اور آگے بڑھئے،
اور اس واقعہ کو سامنے لائیے کہ دوپہر کے وقت جب میں اپنی بچیوں کے ہاتھ میں بندوق دے کر
کہہ رہا تھا کہ بیٹیو! اگر خدا نکردہ ایسا وقت آ جائے کہ دشمن ہمارے دروازے تک آ پہنچے اور ہم
ختم ہو چکے ہوں تو تم اس بندوق سے اپنا خاتمہ کر لینا۔ سوچئے کہ یہ احساسات ہمارے لوحِ شعور
بلکہ تحت الشعور سے کبھی مٹ سکتے ہیں! لیکن ہم آج ان تاثرات کو اُبھار کر سامنے لانے کے
لئے جمع نہیں ہوئے۔ ہم جمع ہوئے ہیں اس لئے کہ بیم و رجا کے اس روح فرسا عالم اور موت و
حیات کی اس جانکاہ کشمکش، میں جن نونہالانِ ملت نے اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھ کر اور اپنا
سر دے کر، ہماری متاعِ حیات، ہمارے بچوں کے مستقبل، ہماری بیٹیوں اور بہنوں کی ناموس،
ہماری قوم کی آبرو، ہمارے وطن کی عزت اور امتِ مسلمہ کے وقار کو بچا لیا اور ہمیں دنیا میں سر اونچا
کر کے چلنے کے قابل بنا دیا، ان کے قدموں پر ہم تحسین و تبریک کے سدا بہار پھول نچھاور کریں،
اور بارگاہِ خداوندی میں اپنے قلبی تشکر و امتنان کے سجدے گزرانیں۔ اور یوں ہم، اللہ کے ان
دنوں کی یاد تازہ کریں۔ کس قدر حیات آور ہیں ان کی یہ حسین یادیں، اور کیسے جنت بداماں

ہیں، ان یادوں کے تاثرات ! ؎

فرشتے پونچھ لیتے ہیں ہیرے رخسار سے آنسو!
الٰہی! آج کس کی یاد میں شبنم فشاں ہوں میں

کش مکش کا آغاز

تاریخ پاکستان میں، ایام اللہ کا یہ سلسلہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء سے شروع نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدا، اس سے پہلے بہت پہلے، ۱۹۳۰ء میں ہو گئی تھی۔ جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ اس کے بعد جب قائدِاعظمؒ نے اس تصور کو عملی پیکر عطا کرنے کے لئے تحریکِ پاکستان شروع کی تو اس کش مکش کی شدت اور تیز ہو گئی۔ اس میں ہندو، انگریز اور مخالفین پاکستان مسلمان، (نیشنلسٹ لیڈر اور علماء، اور جماعتِ اسلامی) ایک طرف تھے اور قائدِاعظمؒ اور ان کے رفقائے کار دوسری طرف۔ قریب دس سال کی کش مکشِ پیہم کے بعد، بالآخر (۱۹۴۷ء میں) تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا اور اس طرح پاکستان وجود میں آ گیا۔

یہ آئینی جنگ تھی اس لئے جب آئینی طور پر اس کا فیصلہ ہو گیا تو ہندو کو اسے بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن ہندو کا تو منشاء ہی کچھ اور تھا۔ آپ تاریخ ہند پر غور فرمایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں متعدد اقوام فاتحین کی حیثیت سے داخل ہوئیں۔ ان میں سے ہر ایک نے کچھ وقت کے لئے وہاں حکومت بھی کی۔ لیکن اس کے بعد، وہ ہندوؤں کے اندر جذب ہو گئی۔ چنانچہ آج ان اقوام میں سے کسی کا جداگانہ تشخص ہندوستان میں کہیں نہیں ملتا۔ وہ سب ہندو قوم کا جزو بن چکی ہیں۔ لیکن مسلمان ایک ایسی سخت جان قوم واقع ہوئے تھے کہ صدیوں تک ہندوستان میں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنا جداگانہ تشخص قائم رکھا جو ہندو کے سینے پر سانپ بن کر لوٹتا تھا۔ جب ان کی حکومت چھن گئی تو ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر، ان کی ملی ہستی کو ختم کرنے کی مہم جاری کی۔ لیکن اس میں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ جب انگریز یہاں سے جانے کی تیاری کرنے لگا تو ہندو نے مسلمانوں کی قومی حیثیت ختم کرنے کے لئے ایک آخری حربہ استعمال کیا۔ اور یہ حربہ تھا، انگریز کے چلے جانے کے بعد، ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم کرنے کا منصوبہ۔ جمہوری حکومت سے مراد ہوتی ہے اکثریت کی حکومت۔ انگریز کے دورِ حکومت کے آخر میں، مسلمانوں کی تعداد، ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک چوتھائی تھی۔ لہٰذا آئینی جمہوریت کی رو سے، مسلمان کے لئے، ہندو کی ابدی غلامی مقدر ہو جاتی تھی۔ ہندو خوش تھا کہ جو مقصد وہ یہ بزور تدبیر صدیوں سے حاصل نہ کر سکا تھا، وہ اب یوں نہایت آسانی سے اخذ آ جائے گا۔ لیکن قائدِاعظمؒ کی ایک ضربِ کلیمی نے، اس گو‌ سالہ سامری کو راکھ بنا کر، جمنا کی لہروں کی نذر کر دیا۔

ہندو کا جذبۂ انتقام

لیکن اس سے اس کے انتقام کی آگ نہایت تیزی سے بھڑک اٹھی۔ اور اس نے تہیہ کر لیا کہ جو کام آئینی منتر نہیں کر سکے، اسے شودشکتی (قوت) کے زور سے سرانجام دیا جائے گا۔ چنانچہ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ہند کا آئینی فیصلہ ہوا۔ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے، جو اس فیصلہ میں ایک نمایاں فریق کی حیثیت رکھتی تھی، ۱۴ر جون کو یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ:-

> آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو پورا پورا یقین ہے کہ جب موجودہ جذبات کی شدت میں کمی آجائے گی تو ہندوستان کے مسئلہ کا حل صحیح پس منظر میں دریافت کر لیا جائے گا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ قومیں ہونے کا باطل نظریہ مردود قرار پا جائے گا۔

پنڈت جواہرلال نہرو ایک طرف تقسیم ہند کی دستاویز پر دستخط کر رہا تھا اور دوسری طرف اپنی قوم کے کان میں کہہ رہا تھا کہ:-

> ہماری اسکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت جناح کو پاکستان بنا لینے دیں، اور اس کے بعد معاشی طور پر اور دیگر انداز سے، ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔
>
> (پاکستان فیسز انڈیا۔ از عزیز بیگ ص ۹۹)

کانگرسی لیڈر جو کچھ دبی زبان سے کہہ رہے تھے، دوسرے ہندو لیڈر اسی بات کو کھلے الفاظ میں دہرا رہے تھے۔ چنانچہ راجہ مہندر پرتاب نے (سنہ ۱۹۵۰ء میں) اعلانیہ کہا کہ:-

> جب تک پاکستان کا وجود ختم نہیں ہو جاتا ہمارا ملک کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ حالات اس طرح بدل رہے ہیں کہ مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ لابینفک ہو گئی ہے۔ بنا بریں میں حکومتِ ہند کو مشورہ دوں گا کہ وہ افغانستان کو اپنے ساتھ ملا کر، پاکستان کو ختم کر دے۔ (ویر بھارت۔ مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۰ء)

چنانچہ اب یہ حقیقت رازِ درونِ خانہ نہیں رہی کہ ہندوؤں نے دسمبر ۱۹۵۰ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد دو دفعہ پھر اسی فیصلہ کو دہرایا گیا لیکن حالات کو ناسازگار پاتے ہوئے وہ اسے ملتوی کرتے رہے۔ تا آنکہ جب انہوں نے پورا پورا اطمینان کر لیا کہ ان کے پاس اتنی قوت جمع ہو گئی ہے کہ پاکستان ان کے سامنے چند گھنٹوں تک کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکے گا، تو انہوں نے، اپنی اکیس ڈویژن (یعنی چار لاکھ سے زیادہ) فوج سے، بغیر کسی اعلانِ جنگ کے، ۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء کی شب، سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے

بہت پہلے، چوروں کی طرح دبے پاؤں، پاکستان پر اچانک ہلہ بول دیا ——— چار لاکھ فوج، ہزاروں کی تعداد میں ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، نہنگ و اژدر سے زیادہ مہیب توپیں اور آسمان پر مدن سون کی سیاہ گھٹاؤں کی طرح چھائے ہوئے، ہوائی دستے۔

یہ اہتمام تھے، اور ایک مشت پر کے لئے!

دنیا کے کسی سیاسی مبصّر کی آنکھ اور فنونِ جنگ کے ماہرین کا کوئی اندازہ، پاکستان کو چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ رہنے کی مہلت دینے کے لئے تیار نہ تھا ——— لیکن سرزمینِ پاکستان کی خاک کے ذرّے ان کے اندازوں کی ہنسی اڑا رہے تھے، اور جنرل چوہدری کی تدبیریں، لال بہادر شاستری کی قسمت کو رو رہی تھیں۔

پاکستان کی حفاظت

اہلِ پاکستان کے لئے سوال، ایک خطۂ زمین کی حفاظت کا نہیں تھا۔ ان کے سامنے اس خطۂ زمین میں اسلام کے مستقبل کا سوال تھا۔ ان کے لئے سوال، بھارت اور پاکستان کے باہمی تصادم کا نہیں تھا۔ ان کے سامنے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب وقت آگیا ہے جب زمانہ بدر و حنین کی داستانوں کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ معرکہ غزوۂ احزاب کا ہے جب باطل کی آندھیاں حق کا چراغ بجھانے کے لئے اُمنڈ کر آگئی تھیں۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ ——— پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا ——— ہندو نے سمجھا تھا کہ اس کا مقابلہ "پاکستانی" سے ہے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا حریف مسلمان ہے۔ اور تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ :—

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

مسلمان کسے کہتے ہیں

یہاں سے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ کونسا مسلمان ہے جو مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ (مثال کے طور پر) اسلام ایک سوسائٹی کا نام ہے اور جو شخص اس سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے اسے مسلمان کہتے ہیں۔ جس طرح کوئی شخص پیدائشی طور پر کسی سوسائٹی کا ممبر نہیں ہوتا۔ وہ برضا و رغبت اور بطیبِ خاطر، کسی سوسائٹی کا ممبر بنتا ہے، اسی طرح کوئی شخص پیدائشی مسلمان نہیں ہوتا۔ اسے برضا و رغبت اور سمجھ سوچ کر مسلمان بننا ہوتا ہے۔ قومی اعتبار سے بے شک ہر وہ بچہ جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہو، مسلمان ہی کہلاتا ہے اور اسے ایسا کہلوانا بھی چاہیئے۔ لیکن جو مسلمان کبھی مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہوتا ہے، اسے مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے کے باوجود مسلمان ہونا پڑتا ہے۔ لیکن بات اس سے بھی واضح

نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ ہمارے سامنے وہ غیر مسلم بھی ہیں جو اسلام قبول کر کے مسلمان ہوتے ہیں۔ کیا وہ اس زمرہ میں شامل ہیں؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ وہ بھی ہماری طرح مسلم قوم کے افراد ہی بنتے ہیں۔ قرآنی مسلمان ہونے کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں۔ اور اس معاہدہ کی شرائط یہ ہیں کہ:-

(۱) إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم۔

(۲) بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

مومن اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اُسے جنت عطا کر دیتا ہے۔

یہ ہیں اس معاہدہ کے دونوں گوشے۔ اس سے واضح ہے کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو اس کی جان اور مال اس کے اپنے نہیں رہتے وہ انہیں فروخت کر دیتا ہے۔ وہ اس کے پاس اس وقت تک امانتاً رہتے ہیں جب تک خریدار انہیں طلب نہیں کرتا۔ اور دوسری بات یہ کہ جنت اسی کو مل سکتی ہے جو اس طرح اپنی جان اور مال بیچ دے۔ اسی لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ: أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ۔ (۳/۱۴۱)۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ یہ ابھی تک دیکھا ہی نہیں گیا کہ تم میں سے کون جہاد کرتا ہے اور کون مصائب و مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کرتا ہے؟ سورۂ توبہ کی جس آیت میں معاہدہ کا ذکر ہے وہیں اس کی تشریح ان الفاظ میں آئی ہے کہ اس طرح اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دینے والے، يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ۔ (۹/۱۱۱) یہ لوگ خدا کی راہ میں، جنگ کے لئے باہر نکل آتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور لوٹتے ہیں اور یا اپنا سر دے دیتے ہیں۔ یہ ہے وہ مسلمان جو کبھی مٹ نہیں سکتا اور جس کی اذانوں سے سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ فاش ہے: ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس مسلمان کا مال تو بہرحال اور بہرکیف، نظامِ خداوندی کی تحویل میں رہتا ہے، لیکن اس کے دعوائے

موت کی حقیقت

ایمان کا حقیقی (TEST) اس وقت ہوتا ہے جب اسے جان دینے کے لئے آواز دی جاتی ہے۔ موت اور حیات کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۶۷/۲) زندگی اور موت کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ اس سے حسنِ عمل کی پرکھ ہو سکے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

اور وہ "سرِّ کلیم و خلیل" جو اس کی اذانوں سے فاش ہوتا ہے اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے کہ :-

عشق ہے مرگِ باشرف، مرگ، حیاتِ بے شرف

وہ، ہندی مسلمانوں کے ترکش کے خدنگِ آخریں، سلطان ٹیپوؒ کے الفاظ میں اس راز کو پا لیتا ہے کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو دن کی زندگی سے بہتر ہے"۔ وہ اس سرِّ سراپردۂ جاں کو اپنے سامنے مشہود دیکھ لیتا ہے کہ :-

لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

یہی ہیں وہ مسلمان جنہیں فرشتے عرش جھک کر سلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔ (41/31) ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے رفیق و دمساز ہیں اور اُخروی زندگی میں بھی تمہارے ہم دوش و ہم عناں چلیں گے۔ اور یہی ہیں وہ مسلمان جن پر خود خدا یہ کہہ کر تبریک و تحسین کے پھول نچھاور کرتا ہے کہ ـــــ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (2/157) یہی ہیں جن پر خدا درود و سلام بھیجتا ہے اور یہی ہیں جو منزلِ انسانیت تک پہنچانے والی سیدھی راہ پر گامزن ہیں۔

معیارِ صداقت

ہم نے دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، حسنِ عمل کے پرکھنے کی کسوٹی موت ہے۔ اسی کو اس نے صداقت کا معیار بتایا ہے جب کہا ہے کہ ـــــ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ (2/94) ـــ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کر کے بتاؤ۔ یہی نہیں کہ جب موت آ جائے تو اس وقت واویلا نہ مچاؤ۔ بلکہ یہ کہ مرنے کی تمنا کرو۔ اپنے دل میں جان دے دینے کی آرزو بیدار رکھو۔ ایسے وقت کے لئے دعائیں مانگو کہ تمہیں موت کا سامنا کرنا پڑے اور تم ہنس کر اسے گلے سے لگا لو۔

لیکن قرآن تو جان کی حفاظت کی بھی بڑی تاکید کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی کس قدر قیمتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اس نے کہا ہے کہ "جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا، یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا"۔ اس ارشادِ خداوندی میں کسی دوسرے کی جان کو ناحق تلف کر دینا ہی نہیں، خود اپنی جان کو ناحق تلف کر دینا بھی شامل ہے۔ یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب قرآن، جان کی حفاظت کی اس قدر تاکید کرتا ہے تو پھر وہ جان دے دینے کو دعوائے ایمان کی صداقت کا معیار کیوں قرار دیتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس اہم سوال کا جواب، میں نے ایک دفعہ اسی ہال میں، اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے دیا تھا کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت میں نے اپنی زبان کے ایک محاورہ سے کی تھی۔ وہ محاورہ

یہ ہے کہ "مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو"۔ ہر شخص مال و دولت کو عزیز رکھتا ہے — اور اسے عزیز رکھنا بھی چاہیئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ مال اور جان میں سے ایک ہی چیز محفوظ رہ سکتی ہو تو عقلمند وہ ہے جو اس وقت جان کی حفاظت کے لئے مال کو قربان کر دے۔ یہاں تک بات ہر ایک کی سمجھ میں آ جاتی ہے اور ایسا کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ "عقلمند" کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کیریکٹر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہر سمجھدار انسان ایسا ہی کرتا ہے۔ کیریکٹر کا مقام اس سے آگے آتا ہے، جب انسان کی جان اور آبرو کی حفاظت میں (TIE) آ پڑے۔ اس وقت جو شخص جان دے کر آبرو بچا لے، اسے صاحبِ کردار کہا جائے گا۔ یہ ہے مقامِ مومن۔ اس محاورہ میں "آبرو" کا لفظ درحقیقت ایک علامت (SYMBOL) ہے۔ دین کے لغت میں اس کے لئے مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی اصطلاح آتی ہے۔ آبرو بھی اقدار میں سے ایک قدر ہے۔ لہٰذا، مسلمان وہ ہے کہ جب جان اور مستقل اقدارِ انسانیت میں تصادم ہو، جب ان میں (TIE) آ پڑے، تو وہ جان دے دے لیکن مستقل اقدار پر آنچ نہ آنے دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

عام حالات میں، زندگی، جان کو محفوظ رکھنے کا نام ہے۔ لیکن جب اس قسم کے تصادم کا مقام آ جائے، تو پھر جان کو محفوظ رکھنے کا نہیں، بلکہ ہنستے ہنستے جان دے دینے کا نام زندگی ہوتا ہے۔ زندگی کو طبعی پیمانوں (PHYSICAL MEASURES) سے ماپنے والوں کے نزدیک، یہ موت ہے، لیکن اقدار کے پیمانوں سے ماپنے والوں کے نزدیک، یہی درحقیقت زندگی ہے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ:-

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ
أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ - (۲/۱۵۴)

جو اقدارِ خداوندی کی حفاظت میں جان دے دیں، انہیں مردہ مت کہو۔ یہ زندہ ہیں۔ لیکن جو لوگ زندگی اور موت کو طبعی پیمانوں سے ماپتے ہیں ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔

زندۂ جاوید

یہی تھے وہ [illegible] جو زندگی [illegible] ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح اعداء کی جانب سے [illegible] کہہ کر [illegible] جگایا کہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم۔ [illegible] اٹھے تو انہیں پکار کر کہا کہ — حَیَّ عَلَی الْفَلَاح — آؤ! لبیک کہ آؤ، [illegible] کامرانیاں تمہارے قدم چومنے کے لئے بیتاب ہیں۔ آج قرآن

کے بعد آسمان کی آنکھ نے ایک نرالی سحر کو ضوفشاں ہوتے دیکھا ـــــ وہ سحر جس سے لرزتا تھا شبستانِ وجود ـــــ آج صدیوں کے بعد فضائے کائنات نے، ملّا کی اذان اور مجاہد کی اذان کا فرق محسوس کیا۔ وہ فرق جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ان مجاہدین کے کانوں میں حیَّ علے الفلاح کی نشید جانفزا پڑی اور یہ لبیک، اللّٰھمّ لبیک کہتے ہوئے تبسّم بہ لب، شمشیر بدست و کفن بدوش، شاداں و فرحاں، پاکستان کی سرحدوں پر سینہ تان کر جا کھڑے ہوئے۔ جنگ کی (STRATEGY) انہیں، ٹھہر کے اس پار روک رہی تھی، لیکن ان کی بے تابیٔ تمنا انہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ:

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

انہیں معلوم تھا کہ ان کا مقابلہ، دشمن کی چار لاکھ مسلح فوج سے ہے۔ جس کے پاس سینکڑوں دیوبے (ٹینک) ہزاروں بکتر بند گاڑیاں، آسمان پر ہوائی بمباروں کا ابرِ آتشیں بار، ان کے پیچھے ایک لپا جرّاعظم ان کی پشت پناہی کے لئے۔ اس کے علاوہ بیرونی طاقتوں کی امداد، ـــ اس احساس سے ان کے دل کی کیا کیفیت ہوئی، یہ مجھ سے نہیں، قرآن کریم سے سنیئے۔ جس نے وجد و مسرت کے پُرکیف عالم میں کہا تھا کہ:

اَلَّذِیۡنَ قَالَ لَہُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدۡ جَمَعُوۡا لَکُمۡ فَاخۡشَوۡہُمۡ فَزَادَہُمۡ اِیۡمَانًا ٭ۖ وَّ قَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰہُ وَ نِعۡمَ الۡوَکِیۡلُ۔ (۳/۱۷۲)

یہ وہ جیالے تھے کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک لشکرِ عظیم جمع کر رکھا ہے تم اس سے ڈرو، تو اس سے ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے سکون و اطمینان کی ایک جنّت قلوب میں لئے ہوئے کہا کہ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ خدا دارم چہ غم دارم۔

اس کے بعد، بارہ سو میل پر پھیلی ہوئی اس رزم گاہ میں جو کچھ ہوا، اس پر زمین حیرت میں ہے۔

تحیّر انگیز

آسمان حیرت میں ہے۔ تاریخ حیرت میں ہے، وقت حیرت میں ہے ـــ اس پر مؤرخ حیراں ہے۔ ـــ سیاسی مبصر حیران، غیر ملکی نامہ نگار آج تک متعجب ہیں۔ دنیا کے ماہرین فنونِ جنگ ورطۂ حیرت میں گم ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا، کہ یہ کچھ کیسے ہو گیا؟

غیر تو ایک طرف خود اپنوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ وہ باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ انسان بھی یہ کچھ کر سکتا ہے۔ ان کے تحیر کی فراوانی اور عقلِ ریاضی دان کی بے بسی تھی جس کی بنا ان کا تخیل اس قسم کے افسانے وضع کرنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں ہوا، فوق الفطرت قوتوں کی طرف سے ہوا ہے۔ وہ اپنی جگہ سچے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اس کا علم نہیں تھا کہ :-

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یہ بال و پرِ روح الامین، آسمان سے نہیں اترا کرتے۔ یہ، موت سے نہ ڈرنے والے، مجاہدین کے خونِ جگر میں پوشیدہ، اور جوششِ کردار سے خود ان کے بازوؤں سے نمودار ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ملائکہ کا نزول اور خدا کی نصرت ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا ہاتھ خود اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے، اور خدا خود اس کی شہادت دیتا ہے جب وہ (مجاہدینِ بدر کو مخاطب کر کے) کہتا ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (8:17) تم دشمن کو قتل نہیں کر رہے تھے ہم کر رہے تھے، تم ان پر تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے ؎ ۔۔۔۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ :-

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

یہ فرق کیوں؟

یہی وہ فرق ہے جس کی وجہ سے قرآنِ کریم نے جماعتِ مومنین سے کہا ہے کہ اگر سامانِ حرب کی کمی نہ ہو، تو مسلمان کا ایک سپاہی، مخالفین کے دس سپاہیوں پر غالب آ سکتا ہے۔ اور اسلحہ کی نسبتاً کمی کی صورت میں بھی وہ اپنے سے کم از کم دگنی تعداد کو مغلوب کر سکتا ہے۔ اس فرق کی بنیادی وجہ وہی ہے جسے میں سنئے اس محاورہ میں بیان کیا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں، اوّل تو مال ہی کم عزیز نہیں ہوتا۔ ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے تھے کہ لالہ جی نے جان دے دی لیکن اپنے علاج کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنے کا حوصلہ نہ کیا۔ لیکن اگر وہ مال خرچ کر بھی دے، تو بھی اس کے نزدیک جان سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں۔ اس لئے وہ اپنی جان کی حفاظت کو زندگی کا آخری جذبہ سمجھتا ہے۔ جس قوم کی زبان میں "شہید" کے لئے کوئی لفظ ہی نہ ہو، وہ کیا جانے کہ دنیا میں کوئی ایسی شے بھی ہے جس کی خاطر انسان جان تک بھی دے دیتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب دہلی میں سوامی شردھانند کو قتل کیا گیا تو (مسلمانوں کی دیکھا دیکھی) ہندو، انہیں "شہید" کہنا چاہتے تھے۔ لیکن شہید کے لئے انہیں ہندی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تھا۔ اس لئے جب ان کی یاد میں تیج اخبار جاری ہوا تو اس کی پیشانی پر "سوامی شردھانند شہید" ہی لکھا

گیا۔ بعد میں انہوں نے ایک لفظ "امر" وضع کیا۔ جس کے معنی "زندۂ جاوید" کے ہوتے ہیں۔ حق کی خاطر جان دینے والے کے لئے انہیں پھر بھی کوئی لفظ نہیں مل سکا۔ اس قوم میں کسی بلند اخلاق قدر کی خاطر جان دینے کا تصور ہی نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے ہاں، جان سے زیادہ گراں بہا متاع کوئی نہ ہو، اس کے نزدیک جان دینے کا جذبۂ محرکہ کیا ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ تھی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو جب بھی میدانِ جنگ میں دیکھا، پیٹھ دکھا کر بھاگتے ہی دیکھا۔ وہ ان جوانانِ رعنا کے سامنے کیسے ٹھہر سکتے تھے جو موت کی ہنسی اڑاتے اور قضا کی تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ کس قدر صحیح کہا تھا امریکن میگزین (ٹائم) کے نامہ نگار نے کہ "جو قوم موت سے آنکھ مچولی کھیلنا جانتی ہو اسے دنیا کی کوئی فوج شکست نہیں دے سکتی" اور کیسا برجستہ جواب دیا تھا ہمارے شگفتہ و شاداب، جنرل انفنٹری کمانڈنگ نے اس کے اس سوال کا کہ آپ لوگ ہندوستانیوں سے اس قدر کثیر التعداد ہونے کے باوجود، ان پر غالب کیسے آجاتے ہیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب میں کہا تھا کہ ــــ اگر حوصلہ، جرأت اور جذبۂ جاں سپاری دکانوں پہ بکا کرتے، تو ہندوستان والے ان اجناس کو امریکی امداد میں حاصل کر لیتے؛ لیکن یہ متاعِ گراں بازاروں میں بکا نہیں کرتی۔ ان کی تخلیق مردِ مومن کے قلب و جگر میں اس طرح ہوتی ہے جس طرح آغوشِ صدف میں گوہرِ تاباں پرورش پاتا ہے۔ یہ پنہاں ہوتی ہے مردِ مسلمان کی نگہِ پاک میں، یہ مستور ہوتی ہے اس کے قلبِ بیباک میں۔ ان کے خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ اس کا نشیمن، اور اس کے حیا پرور ماتھے کی ایک ایک شکن اس کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ یہ جذبے ابھرتے ہیں تلواروں کی جھنکار سے اور بھڑکتے ہیں دشمن کی یلغار سے۔ جب یہ مردِ مجاہد کے سینے میں تلاطم خیز ہوتے ہیں تو دنیا کی کوئی قوت اس طوفانِ قیامت خیز کا مقابلہ نہیں کر سکتی ــــ ہندو، نہ ان مقدس جذبات سے آشنا ہو سکتا ہے نہ ان کی پیدا کردہ قوتیں اس کے حیطۂ تصور میں آ سکتی ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی تھی وہ شے جسے پیدا کرنے کے بعد قرآن نے کہا تھا کہ: وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ۔ ([illegible]) اگر تم ایمان کے ان جذبات کو اپنے اندر بیدار کر لو تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں شکست نہیں دے سکتی۔ دنیا نے قرآن کے اس دعاوی کو، صدیوں بعد، پاکستان کی سرحدوں پہ سچا ثابت ہوتے دیکھا، اور اس حقیقت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر لیا کہ: ؎

مثالِ کلیمؑ ہو اگر معرکہ آزما کوئی!!
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

اس معرکہ آرائی میں، ہمارے جیوش و عساکر نے اجتماعی طور پہ جو کچھ کیا، اس کی تفاصیل ہم سب کو معلوم ہیں۔ اس لئے میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ لیکن ان میں جو کچھ ایک ایک فرد نے کیا تھا وہ اکثر ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ میں اس وقت ان میں سے چند ایک واقعات آپ کے سامنے پیش کرنے کی اجازت

چاہتا ہوں، جن سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ اس قوم کا —— ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارہ ...... عام طور پر کہا یہ جاتا ہے، کہ مشینی اسلحہ کی ایجاد سے انفرادی جرأت و بسالت کا قدر ختم ہو گیا ہے۔ آپ ان حیات افروز اور سینہ تاب واقعات سے دیکھیں گے کہ وہ دور ختم نہیں ہوا۔ ہماری افواج قاہرہ میں ایسے ایسے یگانۂ روزگار شیرانِ غاب چھپے بیٹھے ہیں جو وقت آنے پر وہ کچھ کر دکھاتے ہیں جس پر تاریخ صدیوں تک ناز کرتی رہے۔ آپ ان چند واقعات کو سنیئے اور پھر کہیئے قرطاب زمانہ سے کہ ان کی مثالیں کہیں اور سے لا کر دکھائے۔

☆

میں ابھی ابھی بتا چکا ہوں کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ اگر تم اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو تو موت کی تمنّا کر کے دکھاؤ —— میں سب سے پہلے ان صادقین (سچوں) کی کہانی آپ کو سناتا ہوں جنہوں نے موت کی تمنا ہی نہیں کی، اُسے خود آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

میجر خادم حسین

اس سلسلہ میں میرے سامنے محاذِ چھمب کرن کے فاتح اوّل، میجر خادم حسین (ستارۂ جرأت) کا حسین و جمیل تصور آتا ہے۔ صورت یہ تھی کہ دشمن اپنی بے پناہ فوج اور سیلاب انگیز ٹینکوں کے ساتھ طوفانِ بلا کی طرح بڑھے چلا آ رہا تھا۔ میجر خادم حسین کی ڈیوٹی فوج کو سامان بہم پہنچانے کی تھی، توپ و تفنگ سے نبرد آزما ہونے کی نہیں تھی۔ وہ ایک ٹرک میں سامان لاد کر جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک طرف سے دشمن کے ٹینک بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور جس توپ نے انہیں روکنا تھا، وہ خاموش کھڑی ہے۔ اس نے دُور سے نظر دوڑائی تو دیکھا کہ توپ تو صحیح و سالم ہے لیکن اس کا توپچی شہید ہو چکا ہے۔ میجر خادم حسین کو، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر، ایک طرف کو نکل جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ بھارتی فوج کا میجر نہیں تھا، وہ اللہ کا سپاہی تھا۔ وہ کوندے کی طرح توپ کی طرف لپکا، مورچے میں کودا، اور دوسرے سیکنڈ میں اس خاموش توپ کے دہانے نے ایک آتشیں گولہ اُگلا جس نے دشمن کے سب سے اگلے ٹینک کی دھجیاں فضا میں بکھیر دیں۔ ابھی اس دھماکے کی صدائے بازگشت خاموش نہ ہونے پائی تھی کہ دوسرے گولے نے دشمن کے ایک اور ٹینک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے لیکن اتنے میں تیسرا ٹینک خادم حسین کے مورچے کے اوپر آ چکا تھا۔ یہ جانباز اس ٹینک سے کچلا گیا لیکن اس کے دو گولوں نے لڑائی کا رخ موڑ دیا۔ بھارت کے باقی ٹینک دم دبا کر بھاگ گئے۔ اگلے مورچوں کا انچارج، پلاٹون کمانڈر حیات، حیران تھا کہ یہ "معجزہ" کس فرشتے نے سرانجام دیا۔ وہ جب اس مورچے پر پہنچے تو اسے کیفیت معلوم ہوئی، اور اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ:-

اسلام کے شہید! خدا جانے تم کہاں سے آئے اور کیسے یہاں پہنچے۔ تمہاری جانثاری نے آج جنگ کا رُخ پلٹ دیا ہے۔

میجر خادم حسین کی شہادت، محاذِ چھمب کرن کی پہلی فتح تھی —— ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

یہ تو پھر بھی ایک میجر تھے جن کا احساسِ ذمہ داری نسبتاً گہرا ہوتا ہے۔ ہماری جانباز فوج کے جوانوں تک کے ایسے ایسے واقعات سامنے آتے ہیں، جن سے عقل ورطۂ حیرت میں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک فوجی کمپاؤنڈر

فیلڈ ایمبولینس اور میڈیکل کور کے جوانوں کا کام لڑنا نہیں ہوتا، زخمیوں کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ بلکہ ان کے لئے حکم ہوتا ہے کہ وہ لڑیں نہیں۔ لیکن عشق ان سلاسل کا پابند کہاں رہتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے، بی-آر-بی کے کنارے گھمسان کا معرکہ تھا۔ نہر کے اُس پار، ہمارے چند سپاہی رائفلیں سنبھالے، دشمن کی یلغار کو روک رہے تھے۔ نہر کے اِس کنارے ایمبولینس کور زخمیوں کو سنبھال رہی تھی کہ اتنے میں اس کور کے ایک جوان نے دیکھا کہ ہمارا ایک سپاہی شہید ہو گیا ہے۔ اور اس طرح حملہ روکنے والی دیوار میں شگاف پڑ گیا ہے۔ ایمبولینس کور کا یہ جوان اِدھر تھا، درمیان میں اس نہر کی تند و تیز لہریں حائل تھیں جنہیں دشمن سترہ دن کی یورشوں کے باوجود پار نہ کر سکا۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ایمبولینس کور کے اس سپاہی نے نہر میں چھلانگ لگا دی اور نہر کی موجوں سے کھیلتا ہوا دوسرے کنارے جا لگا۔ اپنے بازو پر لگے ہوئے ریڈ کراس کے نشان کو نوچ کر پھینک دیا اور دوسرے ہی ثانیہ میں اُس شہید سپاہی کی رائفل سنبھالے، اس "بنیانٌ مرصوص" کے شگاف کو پُر کرنے کے لئے مورچے میں جا پہنچا۔ یہ وہ معرکہ تھا جس میں بھارتی فوج کے میجر جنرل نرنجن پرشاد کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ معرکہ سر ہونے کے بعد، جب پلٹن کے جانی نقصان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک نفری زیادہ تھی۔ اور یہ اضافہ، ایمبولینس کور کے اسی جانباز نے کیا تھا۔ جس نے اقبالؒ کے اس تخیل کو حقیقت بنا کر دکھایا تھا کہ ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق!
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ایڈوانس کرو!

اور یہ بھی اسی محاذ کا ذکر ہے کہ ہمارے سپاہی بڑھتے ہوئے آگے جا رہے تھے۔ ایک مقام پر پلٹن کے ایک نائک نے دیکھا کہ ہمارا ٹینک ہٹ ہو چکا ہے اور اس کا ڈرائیور، زخموں سے چور چور، اس کے سائے میں پڑا ہے۔ فیلڈ ایمبولینس کہیں دور تھی۔ یہ نائک آگے بڑھا۔ دیکھا تو وہ سوار بے ہوش پڑا ہے لیکن ہنوز سانس باقی ہے۔ اس نے جلدی سے اپنے جھولے سے پٹی نکالی۔ کہ اس کا خون پونچھے۔ اس کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ تم کون ہو اور یہاں کیسے بیٹھے ہو۔ نائک نے بتایا تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا کہ گرائیں! مجھے چھوڑ دو۔ اور اپنی پلٹن کے ساتھ ایڈوانس کرو۔ وہ نائک کہتا ہے۔ کہ میں نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور اس کے زخموں پر پٹی باندھتا رہا۔ تو اس نے دوبارہ آنکھ کھولی۔ نہ معلوم اس میں کہاں سے اتنا جوش آ گیا کہ اس نے گرج کر کہا کہ معلوم نہیں تم کس بے غیرت

پٹی کے ناٹک ہو۔ دشمن یلغار کر رہا ہے، تمہارے ساتھی آگے بڑھ رہے ہیں اور تم عورتوں کی طرح میرے سرہانے بیٹھے مرہم پٹی کر رہے ہو! دوست! اٹھو۔ لپک کر آگے بڑھو۔ میرے بچانے کی فکر نہ کرو۔ پاکستان کو بچانے کی فکر کرو۔ وہ بچ گیا تو سب کچھ بچ جائے گا۔ ناٹک آگے بڑھ گیا۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ واپسی پر دیکھا تو وہ زخمی شہید ہو چکا تھا۔ اس کی وردی خون میں لت پت تھی اور اس کی پیشانی پر ہنوز وہ شکنیں باقی تھیں جن سے اس نے اس ناٹک کو ڈانٹ کر الگ کیا تھا۔ اور جن میں اس قوم کا مستقبل جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ کس قدر جاذبِ نگاہ تھا اس شہید کا یہ انداز! ؎

اِک خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

بے مثال ایثار

یہ تو وہ زخمی تھے جو میدانِ جنگ ہی میں شہید ہو گئے۔ لیکن جو ہسپتال میں پہنچائے گئے اُن کے جذبۂ ایثار کی داستانیں اُن سے بھی زیادہ تحیر انگیز ہیں۔

قرآن کریم نے مومنین کی ایک خصوصیت یہ بھی بتائی ہے کہ —— يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں لیکن دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں۔ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کی ایمان افروز کہانی، ایک فوجی ہسپتال کی نرس کی زبانی سنیئے۔ اس نے کہا کہ ایک روز ایک وقت دو سٹریچر لائے گئے۔ میں نے اگلے سٹریچر کو اپریشن روم میں داخل کرنا چاہا، تو زخمی سپاہی نہایت نحیف سی آواز میں بولا کہ میری حالت اچھی ہے لیکن دوسرے زخمی کی حالت زیادہ مخدوش ہے۔ اسے پہلے دیکھ لو۔ چنانچہ اس دوسرے زخمی کو ٹیبل پر لٹایا گیا۔ اس کے زخم گو گہرے تھے لیکن تشویش انگیز نہیں تھے۔ نرس کہتی ہے کہ میں اس کی مرہم پٹی میں مصروف تھی کہ نرسنگ سپاہی نے آکر کہا کہ اس دوسرے زخمی کی حالت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ میں لپک کر اُدھر گئی۔ لیکن وہ اتنے میں ختم ہو چکا تھا۔

پوچھیئے تاریخ کے اوراق سے، کہ جانثاری کی اس قسم کی مثالیں کہیں اور بھی مل سکتی ہیں؟

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اور یہ واقعہ غالباً چونڈہ کے محاذ کا ہے کہ دشمن کو شکست دینے کے بعد جب اپنی فوج کے نقصانات کا جائزہ لیا گیا تو دیکھا کہ ایک ٹینک شکستہ حالت میں کھڑا ہے لیکن اس کے سوار کی لاش، ٹینک سے کوئی دو سو قدم آگے جا کر پڑی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لاش، ٹینک سے آگے کس طرح چلی گئی۔ اس معمہ کو بھارتی فوج کے ایک قیدی نے حل کیا۔ اس نے کہا کہ جب اس ٹینک پر گولہ پڑا ہے تو ہم نے دیکھا کہ اس کا ڈرائیور لپک کر باہر آیا۔ اس کے کپڑوں میں آگ لگ رہی تھی اور اس کا چہرا بُری طرح جھلسا

ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سٹین گن تھی۔ تو بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے پیچھے کی طرف جائے، سٹین گن سے فائر کرتا آگے کی طرف بڑھا۔ وہ اسی حالت میں فائر کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا تا آنکہ وہ اس جگہ ڈھیر ہو کر رہ گیا اس نے اپنے آخری سانسوں میں بھی دشمن کے دس بیس سپاہی مار گرائے۔

اور اس ٹینک ڈرائیور کے حوصلے کی داد کون دے سکتا ہے جس کے ٹینک پر گولہ گرا تو وہ دیگر

ٹینک بچا لیا

کو توپ کے ساتھ نکل کر پیچھے آ گیا۔ دشمن کی گولہ باری شدید تھی۔ اس نے پیچھے آ کر دُور سے اپنے جلتے ہوئے ٹینک کو دیکھا تو کہنے لگا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹینک کا انجن محفوظ ہے اسے بچا لینا چاہیئے۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھنے لگا تو ساتھیوں نے کہا کہ پاگل ہو گیا ہے؟ آگ کی اس بارش میں تو زندہ کیسے بچے گا؟ اس نے کہا کہ میں پاگل نہیں ہو گیا، میرے ہوش و حواس سب بجا ہیں۔ اگر میں مر گیا تو پاکستان کی دس کروڑ آبادی میں کوئی کمی نہیں واقعہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر ہمارا ایک ٹینک ضائع ہو گیا تو اس سے ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو گا۔ پاکستان کے پاس ٹینکوں کی کمی ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگ کے اس سمندر میں کود پڑا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ ٹینک کا انجن درست حالت میں تھا۔ وہ جان پر کھیل کر ٹینک کو واپس لے آیا اور اس کے انجن نے بڑا کام دیا۔

گولہ انداز کی ہمّت

اور چونڈہ سیکٹر کے اس توپچی کو ہم کیسے فراموش کر سکتے ہیں کہ اس نے محسوس کیا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ توپ سے گولے بڑی تیزی سے برسنے چاہئیں۔ لیکن ایک گولے کو ٹریکٹر سے کریڈل میں ڈال کر لانے اور توپ میں لوڈ کرنے میں دو تین جوانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور وقت بھی کافی لگ جاتا ہے۔ وہ ٹریکٹر کے پاس جاتا، اڑھائی من کا گولہ اپنی پیٹھ پر لادتا، بھاگ کر توپ کے پاس آتا اور دوسرا توپچی اسے توپ میں دھکیل دیتا۔ جتنے میں یہ گولہ داغا جاتا اتنے میں وہ دوسرا گولہ پیٹھ پر لاد کر لے آتا۔ اس سے ایک توپ سے تین توپوں کا کام لیا جانے لگا۔ لیکن اڑھائی من کا گولہ اس تیزی کے ساتھ پیٹھ پر لاد کر لانا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ ساتھیوں نے اُسے بہت روکا لیکن وہ نہ رُکا۔ اُس نے کہا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی ہے، اسے ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ وہ مسلسل تین روز تک گولے پیٹھ پر لاد کر لوڈ کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک جوڑ ٹوٹ گیا اور کندھے کی بالائی ہڈی کوئی ایک انچ ابھر کر باہر آ گئی۔ اس کے میجر نے اسے پیچھے چلے جانے کو کہا تو اس نے کہا کہ صاحب! یہ بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ میں محض ہڈی ٹوٹ جانے سے ہسپتال چلا جاؤں۔ ڈاکٹر نے دیکھا تو کہا کہ وہ عمر بھر کے لئے معذور ہو چکا ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اچھا ہو گیا۔ اور اب گولے لادنے کے لئے دوسری جنگ کا انتظار کر رہا ہے۔

میں سو کیوں گیا؟

آپ نے وقت کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو ہماری ٹینک رجمنٹ کے ایک دفعدار کی قلبی واردات سے لگایئے۔ بہتر ہو کہ اس کی یہ داستان آپ خود اس کی زبان سے سنیں۔ یہ دفعدار، حافظِ قرآن بھی تھا۔ اس نے وقائع نگار کو بتایا کہ "سب سے پہلے جو ٹینک دشمن کے مقابلہ کو پہنچے وہ میرا ٹروپ تھا۔ میرا ٹینک سب سے آگے تھا۔ بیدیاں کے محاذ پر دشمن سے آمنا سامنا ہو گیا ــــ میں اپنے ٹروپ کے ساتھ مسلسل پانچ روز تک اپنے ٹینک سے فائر کرتا رہا۔ ایک روز، جب شاید تین دن اور تین راتیں کھڑے کھڑے فائر کرتے گذر چکی تھیں، میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے تھام لیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے کہ حافظ جی! کیا ہوا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا؟ انھوں نے کہا آپ سوئے کہاں تھے۔ آپ کو ذرا سی اونگھ آئی تھی۔ اس کے بعد آپ کے سر کو ذرا سا جھٹکا لگا۔ اور آپ بیدار ہو گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ ایک آدھ سیکنڈ تک ہی لگی تھی تو مجھے اطمینان ہوا اور میرا رعشہ تھمنے لگا۔ حافظ جی نے اپنی اس رعشہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب میری آنکھ کھلی، تو یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت دیر تک سویا رہا۔ مجھ پر کچھ عجیب سا خوف طاری ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ کس قدر مقدس فرض کی ادائیگی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگر اس حالت میں میرا ٹینک ہٹ ہو جاتا تو میں حرام موت مر جاتا۔ اور اگلے جہان . . . جب خدا مجھ سے پوچھتا کہ بدبخت بندے! جب کفار میرے قرآن اور مسجدوں کی سرزمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا تو اس وقت تمہیں نیند کیسے آ گئی ــــ تو میں کیا جواب دیتا؟ الحمدللہ کہ میں اس بازپرس سے بچ گیا۔ بس صاحب! اس کے بعد، نہ بھوک محسوس ہوئی، نہ نیند آئی نہ یہ ہوش رہی کہ دشمن کی فوج کتنی زیادہ ہے؛ میں تھا اور خدا کی طرف سے اس پرسش کا خیال۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آ جاتی!"۔

یہ بیکاروں کا مشغلہ ہے

بھوک اور پیاس کے احساس کے مٹ جانے کی بات تو خود مجھ سے محاذ کھیم کرن کی سب سے اگلی صف کے ایک صوبیدار نے بیان کی۔ فائر بندی کے بعد میں جنگ کے مختلف محاذوں پر گیا تھا تاکہ حق و باطل کی ان رزم گاہوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں[1]۔ میں جب کھیم کرن کی اس آخری سرحد پر پہنچا جہاں تک پہنچنے کے بعد ہم نے اپنے سپاہیوں کو آگے بڑھنے سے روک لیا تھا۔ تو ایک نوجوان صوبیدار نے اس معرکہ کی کیفیت

---

[1] ان مناظر کی کیفیات، طلوعِ اسلام میں مسلسل شائع ہوئی تھیں۔ عنوان تھا۔
"پاکستان کی نئی زیارت گاہیں"

مجھ سے بیان کی۔ وہ شروع سے آخر تک اس میں شریک رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ۱۷ ستمبر کی صبح سے ۲۰ کی شام تک، مسلسل جنگ ہوتی رہی اور ہم آگے بڑھتے چلے گئے۔ تا آنکہ ہم یہاں تک پہنچ گئے۔ میں نے استعجاباً پوچھا کہ آپ تین دن اور تین راتیں مسلسل مصروفِ پیکار رہے تو اس میں کھانے پینے کا کیا انتظام تھا؟

اس نے حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا، مسکرایا۔ اور کہا کہ صاحب! ہمیں تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھانا پینا بے کار لوگوں کا مشغلہ ہے۔ میدانِ جنگ میں تو کبھی اس طرف دھیان بھی نہیں جاتا۔ چنے کی پوٹلی میرے پاس تھی۔ لیکن تین دن تک اس کی طرف نگاہ تک اٹھ کر نہ گئی۔

آج تک جب میرے کانوں میں اس کی بات گونجتی ہے کہ صاحب! کھانا پینا تو کچھ بے کار لوگوں کا مشغلہ نظر آتا ہے، تو مجھے اپنے سوال پر خود ہی شرم آنے لگتی ہے۔ سچ ہے۔ کام کرنے والوں کی باتیں ہم بے کار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ ؎

مردِ دیں ما را خبر، او را نظر　　او درونِ خانہ، ما بیرونِ در
صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ　　آخرِ ما چیست؟ تلخیہائے مرگ
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن!
او ہمہ کردار و کم گوید سخن!

ضمناً یاد آ گیا۔ ہم وہاں سے شام کے قریب لوٹے تو راستے میں، کچھ سپاہی، ایک اُجڑے ہوئے کھیت کے کنارے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے ہم سے کہا کہ آئیے! کھانے میں شریک ہو جائیے۔ ہم نے معذرت چاہی اور کہا کہ گاڑی ہمارے پاس ہے، ہم کھانے کے وقت گھر جا پہنچیں گے۔ آپ بسم اللہ کیجئے۔ اس پر ایک سپاہی نے کہا کہ صاحب! اچھا جی۔ یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا پاس کھڑا دیکھ رہا ہو۔ اس نے تو یہ الفاظ نہایت سادگی سے کہہ دیئے لیکن —— پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات —— میں جب اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ جو بات اس اَن پڑھ سپاہی نے سادگی میں کہہ دی تھی، وہ اگر ہمارے اربابِ دانش و بینش کی سمجھ میں آ جائے تو اس معاشرہ کا نقشہ کیا سے کیا نہ ہو جائے۔ یعنی یہ بات کہ:

"یہ تو کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ایک بھائی کھا رہا ہو اور دوسرا بھائی پاس کھڑا دیکھ رہا ہو"!

اُف! کتنی پتے کی بات کہہ گیا وہ اَن پڑھ سپاہی! حقیقت یہ ہے کہ پتے کی باتیں یہی لوگ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بات بنا کر نہیں کہتے۔

میں اسے سلیوٹ کرونگا

لیکن میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ ڈرتا ہوں کہ ان راستوں کے پیچ و خم میں کھو کر، میں کہیں اس جانباز کی داستانِ سرفروشی بیان کرنا بھول ہی نہ جاؤں جس نے اقدار (VALUES) کے تقابل سے یہ راز سمجھا دیا کہ بڑی قدر کی خاطر چھوٹی قدر کو کس طرح قربان کر دیا جاتا ہے۔

ہمارے (فارسی زبان کے) ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگِ محتسب
بر سرِ ما آمد و از جانبِ صہبا گذشت

وہ کہتا ہے کہ میں شراب کی صراحی لئے بیٹھا تھا کہ اتنے میں شہر کا کوتوال اچانک آگیا۔ اس نے صراحی کو تاک کر ایک پتھر مارا۔ لیکن ــــ اے میگسارو! تمہیں مبارک ہو کہ وہ پتھر میرے سر پر آکر لگا اور صراحی بچ گئی۔

ہمارے اس شاعر نے تو محض شاعری کی ہے۔ ان میں یہ ہمت کہاں کہ پتھر کو اپنے سر پہ لے لیں۔ ان کی کیفیت تو، اقبالؒ کے الفاظ میں، یہ ہے کہ:

از نوائے، اشکِ خیزد، ہنگامہ‌ها از مپرس
گر ز جا بادے زجاجِ شاعرِ ما بشکند
کے تواند گفت سشوحِ کارنامۂ زندگی
"نقش پرداز نگش جہانے گر بہ یادِ بشکند"

لیکن اس شاعری کو حقیقت بنا کر دکھا دیا ہمارے ایک ایسے مستِ بادۂ سرفروشی نے جس کا نام تک بھی کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔ بات بڑی اونچی ہے اس لئے اتنی ہی گہرائی سے سننے اور دل میں اتار لینے کے قابل! یہ بات سنائی ہے ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائک نے۔ اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا۔ معرکہ ایسا گھمسان کا کہ قریب قریب جنگِ دست بدست تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ میرا ٹینک جٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھال لی۔ لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرینیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ اپنی فوج کا ایک سپاہی میرے قریب آکر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرینیڈ تمہارے قریب آکر پھٹ رہے ہیں۔ تم اپنا کام کیئے جاؤ۔ اگر کوئی گرینیڈ تمہارے بالکل قریب آکر گرا تو اسے میں لے لوں گا۔ لانس نائک نے بتایا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرینیڈ کو میں لے لوں گا" اس سے اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گھراؤ نہیں! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف رائفل ہے، تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے۔ میں مارا گیا تو صرف ایک رائفل خاموش ہوگی اور اگر تم مارے گئے تو مشین گن بے کار ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے ....

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ ایک گرینیڈ میرے قریب آ کر گرا۔ وہ سپاہی بجلی کی طرح کوندا، اور دھڑام سے گرینیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرینیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بوٹیاں فضا میں اڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر یہ ہوا اور اُدھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا۔ اس لئے اس کے بعد کوئی اور گرینیڈ ادھر نہ آیا۔

وہ لائس نائک یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ مجھے نہ اس جان نثار کا نام معلوم ہے، نہ اس کی پلٹن کا کوئی اتا پتہ۔ اگر مجھے کم از کم اس کے گاؤں ہی کا پتہ مل جاتا تو میں اس کی ماں کے پاس جاتا۔ اس کے قدموں پہ سر رکھ کر اسے مبارکباد دیتا اور اسے کہتا کہ:-

دھن باد ہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں!

پوچھنے والیٹسن کہا رہے کہ اسے اس کے سوال کا جواب مل گیا ہے یا نہیں کہ اس قدر قلیل التعداد اور بے سرو سامان ہونے کے باوجود، پاکستانیوں نے بھارتی فوج کے چھکے کیسے چھڑا دیئے تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز!

یہی سوال جب میں نے چونڈہ کے محاذ کے ایک کرنیل سے کیا تو اس نے کہا کہ ہم نے جب ساری (SITUATION) کا جائزہ لیا تو ہماری سمجھ میں ایک ہی بات آئی کہ ہم لڑائی کی بساط کا نقشہ بدل دیں۔ عام حالات میں یہ نقشہ یوں مرتب ہوتا ہے کہ سب سے آگے سپاہی ہوتا ہے اور اس کے بعد، جوں جوں افسروں کا (RANK) بڑھتا جاتا ہے، ان کا مقام پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جرنیل سب سے پیچھے ہوتا ہے۔ ہم نے نقشہ یوں بدلا کہ ہمارے جرنیل، بریگیڈیئر، کرنیل، وغیرہ، اگلے مورچوں میں سپاہیوں کے ساتھ تھے۔ اس طرح، محمود و ایاز کے ایک صف میں کھڑے ہو جانے کا جو نتیجہ نکلا وہ ہماری عقل و فکر سے بھی باہر تھا — میں نے اس سے کہا کہ لڑائی کا یہ وہ نقشہ تھا جو رسول اللہؐ مرتب فرمایا کرتے تھے۔ حضورؐ سپاہیوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوتے تھے اور اگر کبھی میدان میں بھگدڑ بھی مچتی تھی تو آپؐ اپنے مقام سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ روشنی کے مینار کی طرح جم کر کھڑے رہتے تھے۔ اور اس سے سپاہی، پھر اپنے اپنے مقامات پر واپس آ جاتے تھے۔ جنگ احزاب میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا جس کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کریم نے کہا تھا کہ — لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ (۳۳/۲۱) تمہارے لئے رسول اللہؐ کی یہ روش بہترین ماڈل تھی۔ آپ نے اس اسوۂ حسنہ کا اتباع کیا جس سے ایسے محیرالعقول نتائج برآمد ہو گئے۔

میں یہ کہہ رہا تھا اور اس کرنیل اور اس کے ساتھی سپاہیوں کی آنکھیں نم آلود ہو رہی

تھیں۔ یہ آنسو، مسرت کے تھے کہ انہیں اتباعِ حضور رسالتمآبؐ کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

⁂

لیکن اسوۂ حضور رسالتمآبؐ کا اس طرح کا اتباع، چونڈہ کے محاذ تک ہی محدود نہیں تھا۔ قریب قریب ہر مقام پر اس کے مظاہرے ہوئے تھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں اور اس قسم کی بیسیوں مثالیں میرے افقِ ذہن پر ابھرتی چلی آ رہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں ان سے صرف اس ایک

شہید عزیز

جوانِ رعنا کی مثال پر اکتفا کیوں نہ کروں، جس پر تاریخ ابد الآباد تک ناز کرتی رہے گی۔ اور جس کا نام سننے کے لئے (میں سمجھتا ہوں کہ) آپ بھی بڑی بیتابی سے منتظر ہیں۔ یعنی فخرِ ملتِ اسلامیہ، شہید عزیز، میجر عزیز بھٹی! ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!!
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

اس شہید عزیز نے جرأت و بسالت کے جو کارنامے سرانجام دیئے تھے، آپ میں کون ہوگا جو ان سے بے خبر ہو۔ لیکن میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا۔ میں اس وقت، صرف اس نکتہ کی وضاحت کے لئے وہ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں، کہ اس جنگ میں افسروں نے کس طرح سپاہیوں کو اپنے آپ پر ترجیح دی۔

برکی کے محاذ پر، نہر کے اُس پار، مسلسل پانچ دن اور پانچ راتیں، دشمن کا مقابلہ کرنے اور اسے شکست پر شکست دینے کے بعد، جب فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اب نہر سے پیچھے ہٹ جانا چاہیئے تو نہر کے کنارے ایک شکستہ سی کشتی تھی۔ میجر عزیز اپنے سپاہیوں کو حفاظت پیچھے بھی لا رہے تھے اور ساتھ کے ساتھ دشمن پر فائر بھی کرتے چلے جاتے تھے۔ کشتی کے قریب پہنچ کر انہوں نے سپاہیوں سے کہا کہ جلدی جلدی کشتی میں سوار ہو کر نہر عبور کر جاؤ۔ سپاہی متأمل تھے کہ میجر صاحب پہلے سوار ہو لیں تو ہم سوار ہوں —— لیکن انہوں نے حکم دیا کہ سب سپاہی کشتی میں سوار ہو جائیں۔ سپاہی کشتی میں سوار ہوتے رہے اور میجر عزیز دشمن کی گولیوں کی بوچھاڑ میں، نہر کی پٹڑی پر کھڑے اپنے سپاہیوں کی حفاظت کرتے رہے۔ اس کشتی میں جو سب سے آخر میں سوار ہوا وہ ان سپاہیوں کا افسر میجر عزیز بھٹی تھا۔ کچھ وقت کے بعد، میجر بھٹی کے کان میں، نہر کے اُس پار سے ایک زخمی سپاہی کی آواز آئی جو افراتفری میں اُدھر رہ گیا تھا۔ آواز سن کر میجر عزیز تڑپ اٹھے اور اسے پکار کر کہا کہ:-

"مسکین علی! میرے بچے، فکر نہ کرو، میں پہنچا۔"!

یہ دس ستمبر کا واقعہ ہے۔ گیارہ ستمبر کا پورا دن میجر بھٹی مسکین علی کو واپس لانے کے لئے مضطرب و بیقرار رہے۔ لیکن دشمن نے کوئی پیش نہ جانے دی۔ اور بارہ کی صبح انہوں نے اسی مقام پر جان دے دی جہاں سے مسکین علی کو پکار کر کہا تھا کہ "میرے بچے فکر نہ کرو، میں پہنچا"۔ غالباً وہ

مسکین علی کو ساتھ لئے جنت میں پہنچے ہوں گے۔

اور دوسری مثال اس سے بھی زیادہ درخشندہ و تاباں۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے تاریخ کے صفحات چودہ سو سال پیچھے اُلٹیے اور سرزمینِ عراق میں پہنچ جائیے۔ جیسے حضرت ابو عبیدہؓ نے ابھی ابھی فتح کیا تھا۔ وہاں کے سرداروں نے مسلمانوں کے لشکر کی دعوت کی۔ اس دعوت میں حضرت ابو عبیدہؓ کے سامنے انواع و اقسام کے کھانے چنے گئے تو آپ نے میزبانوں سے پوچھا کہ کیا لشکر کے سپاہیوں کو بھی یہی کچھ دعوت میں دیا گیا ہے؟ جب جواب نفی میں ملا تو آپ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں سپاہی اور سپہ سالار میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ جب تک لشکر کو بھی وہی کچھ نہیں دیا جائے گا جو سپہ سالار کے سامنے پیش کیا گیا ہے، میں کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ چنانچہ آپ نے اس وقت کھانا کھایا جب اطمینان ہو گیا کہ تمام سپاہ کو وہی کچھ کھانے کو دیا گیا ہے۔

اور اب آ جائیے برکی کے میدان میں جہاں تین دن اور تین راتیں میجر عزیز بغیر کچھ کھائے اور آنکھ جھپکے، مسلسل دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے کھڑے تھے۔ ان کے کوارٹر ماسٹر اکرام کا بیان ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ جو روٹی میں ان کے مورچے میں ڈال آتا ہوں وہ وہیں پڑی سوکھتی رہتی ہے تو مجھے ایک ترکیب سوجھی ــــ میجر عزیز کو میٹھی پوریاں بہت پسند تھیں۔ میں نے نہایت لذیذ پوریاں تیار کرائیں اور انہیں لے کر میجر عزیز کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پوریاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھڑے کھڑے ایک پوری اٹھائی۔ اس میں سے ایک لقمہ لیا۔ تو پوچھا کہ کیا سارے جوانوں میں اسی قسم کی پوریاں تقسیم کی گئی ہیں؟ میں نے کہا کہ آج تو اس کا انتظام نہیں ہو سکا کل ان سب کے لئے انہیں تیار کرا دیا جائے گا۔ میجر عزیز نے یہ سنا تو باقی پوری جو ہاتھ میں تھی مجھے واپس دے دی اور کہا کہ کل جب سارے جوانوں کو پوریاں مل جائیں گی تو اس کے بعد میں کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں پوریاں کھاؤں اور جوانوں کو سوکھی روٹیوں پر گزارہ کرنا پڑے۔ اور انہوں نے پوریاں سب جوانوں کے ساتھ دوسرے ہی دن کھائیں۔

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ان کے اردلی اقبال کا بیان ہے کہ ایک بار بڑا ہم سب کے اصرار پر وہ تھوڑی دیر آرام کرنے پر راضی ہو گئے۔ وہ اس وقت ایک بالا خانے کی چھت پر ڈیوٹی دے رہے تھے۔ میں نے کہا کہ نیچے کمرے میں بہت سے لوگوں کے بستر بچھے ہوئے ہیں۔ میں ایک بستر لئے آتا ہوں۔ اس پر آرام کیجئے گا۔ کہنے لگے کہ بالکل نہیں۔ لوگوں کی یہ تمام چیزیں جنہیں وہ چھوڑ کر گئے ہیں، ہماری امانت میں ہیں۔ ہم پر ان کا استعمال کرنا حرام ہے۔ یہ کہا اور وہیں چھت پر لیٹ گئے۔

آپ نے غور کیا کہ مسلمان مجاہد کا کیریکٹر کیا ہوتا ہے؟

عزیزانِ من! مجھے افسوس ہے کہ وقت بڑی تیزی سے بھاگے جا رہا ہے ورنہ ان داستانوں کو، جن کے تذکرہ سے ہمارے عروقِ مردہ میں تازہ خونِ زندگی دوڑ جاتا ہے، ختم کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ نہ ہی یہ ایسے ختم ہی ہو سکتی ہیں۔ یہ سارے حیرت انگیز کارنامے درحقیقت اسی محاورے کے جیتے جاگتے مظاہر ہیں جسے میں نے شروع میں بیان کیا تھا۔ یعنی مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو۔ یہ سب "آبرو" کی حفاظت کے کرشمے تھے۔ جس کے سامنے، ایک عبدِ مسلم

غیرت کے کرشمے

کے نزدیک، جان کی قیمت ہی کچھ نہیں رہتی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے۔ "آبرو" سے مراد صرف حفاظتِ عصمت نہیں۔ اس میں وطن کی آبرو، قوم کی آبرو، اسلام کی آبرو، سب کچھ آ جاتا ہے۔ آبرو، درحقیقت مستقل اقدار کی ترجمان ہوتی ہے۔ اسی کے تحفظ کا دوسرا نام غیرت ہے اور جس قوم میں غیرت نہیں رہتی، وہ دنیا میں سب سے زیادہ بزدل، اور دوں ہمت ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بانگِ درا کی ایک نظم میں کہا ہے کہ جب غلام قادر روہیلہ نے، دلّی کو تاخت و تاراج کر کے، شاہنشاہ کی آنکھیں نکال دیں تو محلاتِ شاہی میں جا کر، شہزادیوں اور بیگمات سے پہلے رقص کرایا۔ پھر اس نے اپنی کمر سے تلوار کھولی اور اسے کھونٹی پر لٹکا دیا اور خود پلنگ پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا اور مغلیہ شہزادیوں سے کہنے لگا کہ میں سویا نہیں تھا۔ جو ڈراما میں نے کھیلا تھا ؎

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

تیمور کے گھر سے جب حمیت گئی تو اس کے ساتھ ہی سلطنت کے چراغ بھی گل ہو گئے۔ لیکن گذشتہ جہادِ پاکستان میں ہماری بیٹیوں اور بہنوں نے غیرت و حمیت کو جس انداز سے ابھارا، اس سے یہ حقیقت نمایاں طور پر سامنے آ گئی کہ ہماری خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں دبی

ہاتھ کی مہندی

ہوئی موجود ہیں جو وقت آنے پر شعلۂ جوّالہ بن سکتی ہیں۔ میدانِ جنگ میں ایک سپاہی کے ہاتھ کو دیکھا گیا تو اس میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ میری شادی میں دو دن باقی تھے کہ جنگ میں جانے کے لئے بلاوا آ گیا۔ میں رخصت ہونے لگا تو میری ماں اور بہن نے، شگون پورا کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگا دی۔ میری منگیتر اپنے ہی گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے قدم اٹھاتے میرے قریب آئی اور اپنی چھنگلی کے خون کے دو قطرے میری مہندی میں ٹپکا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ جب میں گھر سے باہر نکلا تو کسی عورت کی آواز سنائی دی ـــ

"بچے کی فکر نہ کرنا۔ یہ صدا کبھی کبھی آتا ہے۔"——معلوم نہیں یہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی، لیکن اس آواز میں کچھ ایسا جادو کا اثر تھا کہ، پھر بازی جیت لینے یا سر دینے کے سوا، مجھے کسی اور بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

X

بہنوں کے دوپٹے

اور کھیم کرن کے محاذ کے اس واقعہ کو کون بھلا سکے گا کہ جب ایک پلٹن کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو کچھ جوان لڑکیوں نے ان سپاہیوں پر اپنے دوپٹے پھینکے اور کہا کہ —— "ویرو! بھیناں دیاں انہاں چنیاں دی لج رکھنا۔" —— (بھائیو! اپنی بہنوں کے ان دوپٹوں کی لاج رکھنا۔) پلٹن کے حوالدار نے بتایا کہ معلوم نہیں ان دوپٹوں میں کیا تاثیر تھی کہ اس کے بعد، ہمیں اس کا ہوش ہی نہیں رہا کہ ہمارا مقابلہ ٹینکوں سے ہے یا توپوں سے۔ یہ دوپٹے ہماری کمر سے بندھے رہے تھے، اور ان بیٹیوں کے ننگے سر ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے۔ جب تک ہم نے ان دوپٹوں کو کھیم کرن سے آگے نہیں پہنچا دیا، ہم نے دم نہیں لیا۔ اس مہم میں میری پلٹن کے دو سپاہی شہید ہو گئے۔ جب میں ان کی لاشوں کے پاس گیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی ٹوپیوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

غیرت یہ کچھ کر کے دکھایا کرتی ہے۔ لیکن یہ غیرت انہی کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے جو دنیا کی ہر عورت کا احترام اپنا جزوِ ایمان سمجھیں۔ ہمارے سجیلے نوجوان نے اس احترام کا ثبوت کس طرح سے دیا تھا، اس کی شہادت، بھارت کی پارلیمان کے در و دیوار دیں گے جس میں، وہاں کے وزیر دفاع چوان نے بھرے مجمع میں کھڑے ہو کر علی الاعلان کہا تھا کہ:-

> اس سترہ روزہ جنگ میں، کوئی ایسا واقعہ بھی ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نگاہوں سے بھی دیکھا ہو۔

ہمارے سر جھکتے ہیں

ہمارے قابلِ فخر نوجوانوں کی اسی پاکیزگیٔ نگاہ کا صدقہ تھا کہ ہم دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے۔

> ہمیں دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنانے والو! تمہاری عظمتِ کردار اور بلندیٔ سیرت کے سامنے ہمارے سر جھکتے ہیں۔ ہمارے پاس اس سے بیش قیمت کوئی اور نذرانہ نہیں ہے جسے ہم تمہاری یاد میں پیش کر سکیں۔ ہماری اس نذرِ محقر کو قبول کر لیجئے۔

لیکن ایک طرف اگر ہمارا سر، تشکر و عقیدت کے لئے جھکتا ہے تو دوسری طرف اس احساسِ ندامت سے جھکتا ہے کہ ہمارے اندر جو انقلاب جنگ کے سترہ دنوں میں پیدا ہوا تھا اور جس کا نتیجہ

تھا کہ یہ قوم کچھ سے کچھ ہو گئی تھی، وہ جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور ہم پھر سے وہی کچھ بن گئے، جو اس سے پہلے تھے، بلکہ اس سے بھی بدتر۔ قیامت کی خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس سے جب مردے جاگیں گے تو پھر نہیں سوئیں گے۔ یا تو ہم ہی عجیب قسم کے مردے واقعہ ہوئے ہیں اور یا جو قیامت ہم پہ گزری تھی، وہ کچھ نرم قسم کی تھی کہ ہم نے اس کے شور سے آنکھ کھولی لیکن اس کے بعد پھر لمبی تان کر سو گئے۔ معلوم کچھ ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہمارے جاگتے رہنے کے لئے کچھ زیادہ شدید قسم کی قیامت کی ضرورت ہے۔ شاعر نے تو محض شاعری کی تھی جب کہا تھا کہ ؎

ذرا کھل کر پکار اے صور! مجذوبانِ الفت کو — یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں میں

لیکن ہمارے باب میں یہ شاعری حقیقت بن گئی۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے لئے اس قیامت کی ضرورت ہے، جس کے متعلق سورۂ زمر میں کہا گیا ہے کہ، وَ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی اس میں پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو سب پر بے ہوشی طاری ہو جائے گی — ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ — اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو پھر یہ اٹھ کھڑے ہوں گے اور اس انقلابِ عظیم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ جس میں کیفیت یہ ہوگی کہ: اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا — (۳۹/۶۸) زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

اگر ہماری آنکھ کھلنے کی شرط یہی ہے تو پھر جتنی جلدی یہ دوسرا صور پھونک دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اسی میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے اور یہی فطرت کا پیامِ ازلی ہے کہ ؎

میاسا بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور اس کے ساتھ ہی ہمیں قرآن کی اس وعید کو بھی اپنے سامنے رکھنا چاہیئے کہ:-

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا۔ (۹/۳۹)

اگر تم جہاد کے لئے ہر وقت مستعد نہ رہے اور وقت آنے پر میدان میں نہ نکلے
تو تم پر ایک الم انگیز تباہی آجائے گی اور تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی۔
اور تم خدا کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکو گے۔

یہ کچھ پرویز صاحب نے ستمبر ۱۹۶۷ء میں کہا تھا — اس کے بعد اس نو سال کے عرصہ میں ہم کہاں پہنچ چکے ہیں، اس کے متعلق کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ اس کے تصور سے ہمارا جی لرزتا ہے کہ خدا کا قانونِ مکافات بڑا سخت گیر واقعہ ہوا ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ۔

نقد و نظر

۱۔ جدید اصطلاحاتِ معاشیات

ہمارے زمانے میں یوں تو قریب قریب ہر شعبۂ علم نے فنی حیثیت اختیار کر لی ہے لیکن معاشیات کا شمار ان میں سرِفہرست ہوتا ہے۔ علم کے فنی ہو جانے کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں الفاظ کے معانی عام لغوی نہیں رہتے، اصطلاحی ہو جاتے ہیں۔ بنابریں ان علوم (بالخصوص علم المعیشت) کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان اصطلاحات کا صحیح صحیح مفہوم سامنے ہو۔ معاشیات کی اصطلاحات کی تشریح کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کچھ کتابیں شائع ہوئی ہیں، زیرِ تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسے تصنیف تو کیا تھا محمد اسلام صاحب (ایم۔اے۔ معاشیات، ایم۔ اے۔ شماریات) نے لیکن ان کی یہ کوشش ہنوز مسودہ کی شکل میں تھی کہ وہ مرحوم ہو گئے۔ اب اسی مسودہ کے ایک حصہ کو، ان کے برادرِ خورد محمد ظہور نسیم صاحب نے از سرِ نو مرتب کر کے، مرکز فروغ علوم۔ لاہور، کی وساطت سے شائع کیا ہے۔

یہ اس انسائیکلو پیڈیا کا پہلا حصہ ہے۔ پوری کتاب کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ چھ جلدوں میں مکمل ہوگی۔ ان اصطلاحات کو انگریزی حروفِ تہجی کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے اور زیرِ نظر جلد میں (۲۴۶) اصطلاحات (A) سے (C) تک شامل ہو سکی ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا گیا ہے۔ یہ انہی لوگوں کے لئے مفید نہیں، جن کا تعلق علمِ معاشیات سے ہے۔ یہ کاروباری حلقہ کے لئے بھی مفید ہے۔ حتیٰ کہ عام لوگوں کے لئے بھی جو (مثلاً) بینکوں میں حساب کھولتے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ان اصطلاحات کا انڈکس تو دیا گیا ہے لیکن صفحات کے نمبر (غالباً سہو نظر سے) نہیں دیئے گئے۔ امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ نیز اس کی بھی ضرورت ہے۔ شروع میں اردو اصطلاحات کی فہرست دی جائے۔

کتاب کی کتابت۔ طباعت۔ جلد عمدہ ہے۔

قیمت مجلد -/۱۳ روپے - پلاسٹک کور -/۱۵ روپے۔

ملنے کا پتہ - مرکز فروغ علوم - (۱۴۴)- بی - محلہ چوہالہ - اندرون بھاٹی گیٹ - لاہور

۲۔ تہذیب الصلوٰۃ

اس کتابچہ کو (جماعتِ اسلامی کے دیرینہ رفیق کار) انشاء اللہ خان صاحب نے مرتب، اور ادبِ اسلامی پبلیکیشنز، منصورہ ـــــ لاہور، نے شائع کیا ہے۔ اس میں مرتب کے الفاظ میں "نماز کے سلسلہ میں عام طور پر مشاہدہ میں آنے والی (فقہ حنفی کی رو سے) غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے" ان "غلطیوں اور کوتاہیوں" کا تعلق نماز پڑھنے کے طریق ـــــ مسائلِ طہارت ـــــ نماز کے اوقات۔ حرکات و سکنات۔ (مثلاً) رکوع، سجود، قومہ، قعدہ وغیرہ کے آداب سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نماز میں اس کے جملہ آداب و قواعد کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ بنا بریں، جو حضرات حنفی طریق سے نماز پڑھتے ہیں ان کے لئے یہ کتابچہ مفید ثابت ہوگا۔ یہ چھوٹے سائز کے (۸۸) صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت اس کی تین روپے ہے جو ہمارے نزدیک زیادہ ہے۔ (تبلیغی مقاصد کے لئے قیمت (۱۸۰) روپے سیکڑہ مقرر کی گئی ہے)

صلوٰۃ جملہ مومنین کے لئے فرض قرار دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی طریق ہونا چاہیئے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ نے ایک ہی طریق پر ادا کیا ہوگا۔ لیکن دین کے، مذہب میں تبدیل ہو جانے کا نتیجہ یہ ہے کہ امت، مختلف فرقوں میں بٹ چکی ہے اور ہر فرقہ کی نماز بھی الگ ہے۔ اور مسجدیں بھی الگ ـــــ اور تماشہ یہ کہ ہر فرقہ اپنی نماز کو رسول اللہؐ کی ہی طرف منسوب کرتا ہے۔ ہم جس لامرکزیت کے دور سے گذر رہے ہیں اس میں، ہمارا مسلک یہ ہے کہ جس جس طریق سے مختلف فرقے نماز پڑھتے چلے آرہے ہیں، ان میں ردّ و بدل کرنے، یا کسی نئے طریق کے وضع کرنے کا کسی فرد یا گروہ کو حق حاصل نہیں۔ (فرقہ اہلِ قرآن اسی غلط نگہی کا مرتکب ہو رہا ہے۔) جب ہم میں مرکزیت قائم ہو جائیگی تو وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے صلوٰۃ کی بھی کوئی واحد شکل قائم کر دے گا۔ اس وقت تک بہرحال موجودہ شکلیں قائم رہیں گی۔ "مذہب" میں ہوتا ہی یہی ہے۔ وحدت تو دین سے پیدا ہوتی ہے ـ یہ تو پھر بھی نماز کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہمارے ہاں تو، "خدا اور رسول" تک بھی فرقوں کے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ کی بات ہے، دارالعلوم دیوبند کے مدرس، مولانا انظر شاہ صاحب نے تفسیر مدارک کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا۔ اس کے تعارف میں لکھا تھا کہ:۔

> صدیوں سے ہمارا سرمایۂ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختۂ مشق ہے۔ یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے۔ کوئی بری بات نہیں۔ علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو، خوش آئند ہے۔ جس جماعت کی جانب سے ہو قابل پذیرائی ہے۔ مگر افسوس "علم" جیسے لازوال، بے نیت نشان، سب کی دولت۔ سب کے سرمایہ کو بھی عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا۔

لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اپنے اپنے مسلک کی ترجمان تفسیر و حدیث
کی طویل طویل کتابیں ہی بن گئیں۔

اس مرثیہ کے بعد سنئیے کہ اس کا علاج کیا بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:۔

بہر حال جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی نقطۂ
نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ مارچ ۱۹۶۹ء)

"خاص حنفی نقطۂ نظر سے قرآن مجید کی تفسیر" ـــ یا للعجب! یہ تو رہا "کتاب اللہ" کا قصہ ـــ اب ملاحظہ فرمائیے "سنتِ رسول اللہؐ" کا ماجرا۔

۱۹۵۳ء میں "زجاجۃ المصابیح" کے نام سے احادیث کا ایک نیا مجموعہ شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے (مولانا) عبدالماجد (دریابادی) کے جریدہ صدق (لکھنؤ) کی ۹ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں کہا گیا:۔

خطیب تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبویؐ کا یہ مستند، کارآمد، اور نسبتاً مختصر ہونے کے باوجود، بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا آ رہا ہے اور عوام و خواص سب کے حق میں شمعِ ہدایت کا کام دے رہا ہے۔ لیکن صاحب مشکوٰۃ، باوجود اپنی جلالۃ القدر کے، بہر حال حنفی المذہب نہ تھے۔ شافعی تھے۔ اس لئے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتاب میں جا بجا آ جانا بالکل قدرتی تھا، اور اس لئے علماء حنفیہ ایک اسی قسم کے دوسرے مجموعۂ احادیث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت ان کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصہ میں آئی ہے۔ (مقام حدیث۔ شائع کردہ۔ ادارہ طلوع اسلام)

یہ ہے پوزیشن اس "کتاب و سنت" کی جس کے متعلق اُمت کو یہ کہہ کر مطمئن کیا جا رہا ہے کہ وہ تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ لہٰذا مملکت کا قانون اس کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ طلوع اسلام کیوں اس پر اصرار کرتا ہے کہ مملکتِ اسلامیہ کے لئے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ:۔

(۱) قرآن کو خود قرآن سے سمجھا جائے۔ (کسی تفسیر کی رو سے نہیں کیونکہ ہر تفسیر فرقہ وارانہ رنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔

(۲) قرآن خالص کو ضابطۂ قوانین کی بنیاد قرار دیا جائے۔

(۳) احادیث میں سے صرف انہی کو صحیح تسلیم کیا جائے جو قرآن کے مطابق ہوں۔ (کیونکہ احادیث کے مجموعے

بھی فرقہ وارانہ عصبیت کے ماتحت مرتب کئے گئے ہیں۔)

— چونکہ اس طریق کار کی رو سے، فرقے باقی نہیں رہتے، اس لئے طلوع اسلام کی اس تجویز کی شدت سے مخالفت ہوتی ہے — اور اس مخالفت میں فطری طور پر تمام فرقے برابر کے شریک ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اگر یہ طریق اختیار نہ کیا گیا تو کوئی ضابطۂ قوانین ایسا مرتب ہو نہیں سکے گا، جس کا اطلاق، مملکت کی طرف سے، تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر کیا جا سکے، اور جب ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکے گا، تو ہمارے آنے والی نسل اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہو جائے گی کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس کے ساتھ چپکے رہنا عبث ہے۔ ہمیں سیدھے سادے طریق سے سیکولر نظام اپنا لینا چاہیئے۔

دنیا کی ہر مذہب پرست قوم کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوگا — اس وقت ہم تو شاید زندہ نہ ہوں، لیکن طلوع اسلام کے یہ الفاظ ہمارے سوزِ جگر کے شاہد ہوں گے۔

۴۔ ماہنامہ میثاق۔ لاہور، کا خاص نمبر

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے، اپنے آپ کو، اپنے دستور کے مطابق، قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک انجمن کی بھی تشکیل کی ہے جس کا نام "انجمن خدام القرآن" ہے۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ہر سال ایک کانفرنس کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔ اس کی تیسری سالانہ کانفرنس گذشتہ ماہ میں، لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ ماہنامہ میثاق کا یہ خصوصی نمبر اس کانفرنس کی روئیداد، اور اس میں پیش کردہ خطابات اور مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کی "رپورٹنگ" بڑے شگفتہ اور دلکش انداز سے مرتب کی گئی ہے۔

میثاق کا سالانہ چندہ پندرہ روپے، اور اس خاص نمبر کی قیمت -/۹ روپے ہے۔ یہ خاص نمبر، سفید کاغذ پر بڑے سلیقہ سے طبع کیا گیا ہے اور دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ ملنے کا پتہ۔
(۱۲) افغانی روڈ، سمن آباد۔ لاہور

لاہور میں مفکرِ قرآن، محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن ہر اتوار
صبح ساڑھے آٹھ بجے ۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن گلبرگ)
میں ہوتا ہے۔

باب المراسلات

نفلی حج

سال رواں کے لئے حج کی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے، وزیر امور مذہبیہ، محترم کوثر نیازی صاحب نے بتایا کہ:-

> اس بار نفلی حج کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ اقدام زرمبادلہ کی بچت کے پیشِ نظر کیا جا رہا ہے۔ (نوائے وقت۔ بابت ۱۹ جون)

ضمناً یہ وضاحت ضروری ہے کہ مروّجہ احکامِ شریعت کی رُو سے، پہلی بار کا حج "فرض" قرار دیا جاتا ہے، اور اس کے بعد کا حج "نفلی" — نیازی صاحب نے نفلی حج پر پابندی کی وجہ "زرمبادلہ کی بچت" بیان کی ہے۔ لیکن اسلامی ممالک کے بعض علماء کے نزدیک ایسی پابندی شرعاً ضروری ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس موضوع پر ہمیں کچھ عرصہ پہلے محترم پروفیسر رفیع اللہ شہاب کا ایک گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

* طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۷۳ء میں راقم نے علمائے الجزائر کا ایک فتویٰ پیش کیا تھا جس میں یہ فیصلہ درج تھا کہ حج کے دنوں میں چونکہ سخت اژدحام ہوتا ہے اور قربانی کرنے والے کو اپنے قربانی کے جانور کا علم تک نہیں ہوتا۔ اور پھر اس کا گوشت عام طور پر ضائع ہو جاتا ہے، اس لئے اگر قربانی کے جانور کے بجائے اس کی قیمت خیرات میں دے دی جائے تو جائز ہے۔ یہ فتویٰ وہاں کے مشہور عالمِ دین علامہ بشیر الابراہیمی مرحوم نے دیا تھا جس کی تصدیق بعد میں الجزائر کے علماء کی مجلس نے کر دی۔ الجزائر والے حجاج اپنے علماء کے اس فتویٰ پر کئی سالوں سے عمل کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر دوسرے حجاج پر بھی پڑتا تھا۔ چنانچہ جب اس فتویٰ کا دائرۂ اثر پھیلنا شروع ہوا، تو رابطۃ العالم الاسلامی، مکۃ المکرمہ، نے اس کا نوٹس لیا اور اپنے سترھویں سالانہ اجلاس میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فتویٰ کو رد کر دیا۔ ہمارے ہاں علمائے الجزائر کا فتویٰ طلوعِ اسلام کے سوا کہیں شائع نہیں ہوا۔ لیکن رابطۃ العالم الاسلامی نے اس کی جو تردید کی، تو اس کی خوب پبلسٹی کی گئی، اور ہمارے ملک کا شاید ہی کوئی اخبار یا رسالہ ایسا ہو جس نے اسے نقل نہ کیا ہو۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔

حج کے بارے میں علمائے الجزائر نے مذکورہ بالا مسئلے کے بارے ہی میں فتویٰ نہیں دیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا مسئلہ بھی تھا۔ اور وہ نفلی حج کی شرعی حیثیت کے بارے میں تھا کہ موجودہ حالات میں اس

کا ادا کرنا کہاں تک جائز ہے۔ کیونکہ فرض حج ادا کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ آسانی اور سہولت سے یہ فریضہ ادا نہیں کر سکتے۔ تو نفلی حج میں شمولیت، فرض حج والوں کے لئے رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ایسی صورت حالات پیدا ہو جاتی ہے کہ نفلی حج والے تو کئی کئی حج ادا کر لیتے ہیں اور فرض ادا کرنے والوں کو اپنا فریضہ ادا کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔

بنا بریں جس طرح قربانی کے جانور کے بارے میں علمائے الجزائر نے یہ فتویٰ دیا کہ اس کی قیمت خیرات میں دے دینا جائز ہے۔ اسی طرح نفلی حج کے بارے میں بھی انہوں نے یہ رائے دی کہ اس پر ہونے والے اخراجات نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کر دیئے جائیں تو وہ نفلی حج سے افضل ہے۔ اتفاق سے انہی دنوں میں بھی الجزائر میں تھا، ہم جمعہ کی نماز کے لئے الجزائر کی مشہور تاریخی مسجد کتشاوہ میں جمع تھے۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک صاحب علم نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے نفلی حج کے سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ فرض نماز ادا کرنے والوں سے اس طرح بھری ہوئی مسجد میں کوئی "نیک بخت" زبردستی گھس کر نفل نماز ادا کرنا چاہے یا کسی فرض نماز پڑھنے والے کو نکال کر اس کی جگہ پر نفل نماز ادا کرے، تو اس بارے میں شریعت اسلامی کا یہی فیصلہ ہوگا کہ ایسا کرنے سے یہ شخص گناہ کا مرتکب ہوگا۔ سرمایہ دار حضرات بھی حج کے سلسلے میں یہی کچھ کر رہے ہیں اور علماء حضرات نے انہیں کبھی اس زیادتی پر ٹوکا نہیں۔ یہ حضرات اپنے زائد سرمائے کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو ان کے فرض سے روکنے کا موجب بن رہے ہیں، جو بہرحال نیکی شمار نہیں ہوگی۔ اس کے بجائے اگر وہ نفلی حج پر خرچ ہونے والی یہی رقم اللہ کی راہ میں نیکی کے دوسرے کاموں پر خرچ کریں تو عنداللہ ماجور ہوں گے۔

رابطۃ العالم الاسلامی نے اس فیصلے کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار اسی قرارداد (نمبر ۲۳) میں کیا جس میں اس نے قربانی کے متعلق الجزائر کے موقف کو مسترد کیا تھا۔ قرارداد کی جز (ب) میں قربانی کے بارے میں فیصلہ تھا اور اس سے چند سطور آگے۔ بلکہ بالکل متصلاً۔ جز (ج) میں نفلی حج کے بارے میں علمائے الجزائر کے مذکورہ بالا فیصلے کی تائید کی گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کونسی مصلحتیں تھیں کہ ہمارے علماء حضرات نے آدھی بات (یعنی قربانی کے متعلق) نقل کر کے اس کے دوسرے حصے پر پردہ ڈال دیا۔ اسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

...... الحجّ ركنٌ من اركان الاسلام فى العمرِ مرةً وما زاد فهو تطوّعٌ، وانّ ابواب الخير والتقرب الى الله تعالىٰ كثيرةٌ جداً وليستْ محصورةً فى اداء شعيرة الحج والعمرة، فانّ من سَبَقَ له اداء هذه الشعيرة الاسلامية او تكرّرت منه اداؤها ثم تعلّقت بعد ذلك بنيّة الايثار لغيره من اخوانه المسلمين ممّن لم يسبق لهم اداء الفريضة حتّى يتمكنوا من ادائها بتيسيرٍ وسهولةٍ

فسوف یؤتیہم اللہ اجراً عظیماً۔

(اخبار العالم الاسلامی عدد ۲۵۹ شمارہ ۵ جنوری ۶۹ صفحہ ۱۳)

(ترجمہ) حج ان ارکانِ اسلام میں سے ہے جو ساری عمر میں صرف ایک دفعہ فرض ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو زائد حج ادا کیا جائے گا وہ نفل شمار ہوگا۔ نیکی اور تقرب الٰہی کے حصول کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں اور یہ نیکیاں فرض حج یا عمرہ ادا کرنے تک محدود نہیں۔ جس نے ایک دفعہ یہ فرض پورا کر لیا یا اس کے بعد نفل حج بھی ادا کیا ہے۔ اگر وہ آئندہ اس نیت سے مزید نفل حج پر جانے سے باز رہے گا کہ اس کے ان مسلمان بھائیوں کو موقع مل سکے جنہوں نے ابھی تک اصل فریضہ ادا نہیں کیا۔ اور اس کے نہ جانے سے وہ سہولت اور آسانی سے یہ عبادت سرانجام دے سکیں، تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بہت بڑا اجر دے گا۔

آپ نے دیکھا کہ علمائے الجزائر اور رابطۃ العالم الاسلامی کے فیصلوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، صرف الفاظ کا معمولی سا فرق ہے۔ علمائے الجزائر کے نزدیک فرض عبادت میں نفل عبادت کے ذریعے خلل ڈالنے والا گنہگار ہوگا۔ رابطہ والوں نے بھی یہی بات کہی ہے لیکن الفاظ ذرا نرم استعمال کئے ہیں، کہ اگر نفل حج والا فرض حج والوں کی سہولت و آسانی کے لئے اس نفل عبادت سے باز رہے تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسے اجرِ عظیم ملے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس اجرِ عظیم کو چھوڑ کر نفل حج پر اصرار کرے گا تو وہ ضرور گناہ گار ہوگا۔

کس قدر موجبِ تاسف ہے یہ حقیقت کہ رابطۃ العالم الاسلامی کے یہ دونوں شرعی فیصلے جو (نمبر ۲، ۳) میں ایک ہی صفحے پر موجود ہیں، ان میں اس مسئلے کو تو اچھالا جاتا ہے جس کے نتیجے میں قربانی کی کھالوں کے ملنے کا امکان ہے، لیکن دوسرا فیصلہ جس میں امتِ مسلمہ کی مجموعی بھلائی ہے۔ اس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اربابِ صدق و صفا کا تو یہ شیوہ نہیں ہونا چاہیئے۔

نفل حج کے متعلق آپ نے اربابِ شریعت کا فیصلہ ملاحظہ فرما لیا۔ ہم حضراتِ اہلِ مذہب سے گذارش کریں گے کہ انہوں نے نفل حج پر جو پابندی محض زرمبادلہ میں بچت کے لئے عائد کی ہے اسے اس شرعی فیصلہ کی رو سے عائد کریں۔ یہ پابندی مستقلاً ہوگی، ہنگامی نہیں ہوگی۔ اور قوم کے بیشتر اجتماعی مفاد کا موجب۔

واضح رہے کہ دین کے نظام میں تو حج کی حیثیت اور اہمیت ہی کچھ اور ہے۔ لیکن اس وقت حج ایک مذہبی فریضہ کے طور پر ادا کیا جاتا ہے، اس لئے ہماری اس گفتگو کا تعلق اسی

عورتوں کے حقوق

یوں تو ہماری زندگی کا کونسا گوشہ ایسا ہے جس میں تضاد نہیں ـــــ تضاد قول اور عمل میں ـــ تضاد قرآنِ کریم اور مروّجہ قوانین میں، خواہ وہ قوانین کسی سابقہ دَور میں وضع ہوئے ہوں اور انہیں فقہ، یا احکامِ شریعت کا نام دے دیا گیا ہو اور خواہ وہ دورِ حاضر میں مغربی نظامِ جمہوریت کے تحت مسلمان مملکتوں میں وضع اور نافذ ہوئے ہوں ـــــ لیکن ان تمام گوشوں میں، سب سے زیادہ اہم گوشہ وہ ہے جس کا تعلق عورتوں کی پوزیشن سے ہے۔ ہمارے قول کی یہ کیفیت ہے کہ ہم ساری دنیا کو مخاطب کر کے نہایت فخر سے، ببانگِ دہل، اعلان کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو بلند ترین مقام عطا کیا ہے۔ لیکن عملاً کیفیت یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں عورت سے زیادہ مظلوم، مجبور و مقہور طبقہ کوئی نہیں۔ طلوعِ اسلام مظلوم انسانیت کے ہر طبقہ کی حمایت میں آواز بلند کرتا رہتا ہے۔ اس بنا پر وہ عورتوں کے حقوق کے متعلق بھی شروع سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے۔ چونکہ یہ بات ہماری مذہبی پیشوائیت پر سخت گراں گذرتی ہے کہ عورت کو مرد کے برابر حقوق دے دیئے جائیں۔ اس لئے، طلوعِ اسلام کے خلاف جو پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے، اس میں یہ "الزام" بھی شامل ہوتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی طرف سے عورتوں کے حقوق کے حق میں اس کی مسلسل پکار کے نتیجہ میں، ۱۹۶۱ء میں "مسلم فیملی لاز" کے نام سے ایک آرڈی ننس جاری ہوا۔ اس میں عورتوں کو وہ حقوق تو نہیں دیئے گئے تھے جو انہیں قرآنِ کریم عطا کرتا ہے، لیکن (بایں ہمہ) اس میں مروّجہ قوانینِ شریعت میں سے بعض کے معاملہ میں اس مظلوم طبقہ کے بندھنوں کو ذرا سا ڈھیلا کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت اسے بھی کس طرح برداشت کر سکتی تھی؟ چنانچہ اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام کو خاص طور پر ہدفِ سب و ستم، بنایا گیا۔ غنیمت ہے کہ اربابِ اقتدار نے اس غوغا آرائی کا کوئی اثر نہ لیا اور وہ آرڈیننس بدستور نافذ رہا، اگرچہ اسے منسوخ کرنے کے لئے متعدد بار یورشیں کی گئیں۔

موجودہ حکومت نے، عورت کی مظلومیت سے متاثر ہو کر، گذشتہ جنوری میں تحفظ حقوقِ نسواں کے لئے، محترم یحیٰی بختیار (اٹارنی جنرل) کے زیرِ صدارت ایک کمیٹی متعین کی تھی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ کی قسط اوّل اخبارات میں شائع کی ہے جس میں کچھ سفارشات کی گئی ہیں۔ (ہمارے سامنے پاکستان ٹائمز کی ۱۹ اور ۲۰ جولائی ۱۹۷۶ء کی اشاعتیں ہیں)

شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں، ان کی بے بسی کا مرحلہ "طلاق" کی شکل میں سامنے آتا ہے ـــ مروّجہ

"قوانینِ شریعت" کی رُو سے، مرد کو تو یہ حق ہر وقت حاصل ہے کہ وہ "طلاق ـــ طلاق ـــ طلاق" کہہ کر بیوی کو (مع اس کے بچوں کے) جس وقت جی چاہے گھر سے نکال باہر کرے، لیکن عورت خواہ کتنے ہی ظلم و تشدد کا شکار کیوں نہ ہو رہی ہو، اسے نکاح کی "زنجیروں" سے آزادی حاصل کرنے کے لئے، بڑا صبرآزما اور رسواکن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ ہم پہلے یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ۱۹۶۱ء کے آرڈیننس میں طلاق کے متعلق کیا کہا گیا تھا، اور طلوعِ اسلام نے اس پر کیا تنقید کی تھی۔

طلاق

طلاق کے معنی ہیں "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا" چونکہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب جی چاہے، اپنی مرضی سے، اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا۔) چنانچہ اس باب میں سورۃ النساء میں ہے۔

> اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ، جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا، اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۳۵)

اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہوالمراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہو گا۔

ہمارا مروّجہ قانون

طلاق کے بارے میں ہمارے مروّجہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں، جن کا دُور کیا جانا ضروری ہے۔

(i) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد، اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(ii) چیئرمین، ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے ـــ اگر

مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے (۹۰) دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدۂ نکاح منسوخ تصور ہوگا۔

شق (ز) میں نقص یہ ہے کہ:-

۱۔ اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ چیز قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ:-

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ، طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی چیز ہے۔

ب۔ دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے۔)

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہوگی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروّجہ قانون کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا اطلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہہ دے کہ میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہوگی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں۔ لہٰذا اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ:

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اُسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے ......

شق (ز) میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی

جائے گی۔ (نوّے (۹۰) دن بطورِ عدّت رکھے گئے ہیں۔)

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہوگی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اسی وقت سے شروع ہوگی۔

(ب) عدّت کی مدّت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدّت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:۔ ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔

طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہوگیا۔ اس کے بعد، عدّت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ البتہ اگر طلاق مرد نے حاصل کی تھی، عورت فسخِ نکاح نہیں چاہتی تھی۔ تو یہ مرد اگر چاہے تو، عدّت کے دوران اس عورت سے نکاح کرسکتا ہے۔ (سورۂ بقرہ۔ آیت نمبر ۲۲۸)

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عدّت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کرسکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جس دن چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کرسکتا ہے۔ بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق (فضیلت) کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر عدّت کے دوران یہ سابقہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہ کریں تو عدّت کی مدّت ختم ہونے پر انہیں اس امر کی اطلاع عدالت مذکور کو دینی ہوگی۔ (ملاحظہ ہو آیت ۲/۲۳۲)

(د) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدّت کی مدّت کے بعد بھی آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ (یہ شادی، طلاقِ اوّل کے بعد کی شادی کہلائے گی۔) اگر انہوں نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کرلی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق، ان میں طلاق ہوگئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدّت کے دوران یا عدّت کے بعد، آپس میں شادی کرسکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی، طلاق کے بعد کی، شادی ہوگی۔)

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہوجائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کرسکتے۔ نہ عدّت کے دوران، نہ اس کے بعد، قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کرسکتے ہو۔۔۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کرسکتے،

یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآنِ کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے ـــــ یعنی (د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے، یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے، تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ ($\frac{2}{230}$)

یہ تھی ہماری تنقید ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین میں طلاق کے متعلق شق پر۔ اس آرڈی نینس میں تو مناسب ترمیم نہ کی گئی لیکن (غنیمت ہے کہ) زیرِ نظر کمیٹی نے اپنی سفارش میں، "اگر عورت کو حقِ طلاق تفویض کیا گیا ہو" کی شرط حذف کر دی ہے۔ اس جہت سے طلاق حاصل کرنے کا حق، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں طور پر مل سکے گا۔

خلع اور طلاق

لیکن اس سفارش میں پھر ایک خلا موجود ہے۔ اصل یہ ہے کہ صدیوں سے مروّج چلے آنے والے قوانینِ فقہ سے ہم اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ہم غیر شعوری طور پر ان کے حلقوں میں مقید رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں، عقدِ نکاح کے فسخ ہو جانے کے لئے ایک ہی اصطلاح آئی ہے ـــــ طلاق ـــــ اور اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن فقہ میں مرد کی طرف سے فسخِ نکاح کو طلاق کہا گیا ہے، اور عورت کی طرف سے اس اقدام کو خلع سے تعبیر کیا گیا۔ یہ فرق اگر محض لفظی ہوتا، تو چنداں نقصان رساں نہ ہوتا۔ (اگرچہ ہمارے نزدیک یہ لفظی تفریق بھی قرآن پر اضافہ ہوتی) لیکن اس تفریق کا اثر بہت دور تک چلا گیا۔ جس سے (مرد کے مقابلہ میں) عورت پھر کئی بندھنوں میں بندھ گئی۔ ان اثرات کی وضاحت کے لئے طلوعِ اسلام بابت نومبر ۱۹۶۵ء میں، محترم ابوالشہاب رفیع اللہ صاحب کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ موضوعِ زیرِ نظر کی اہمیت کے اعتبار سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اسے درج ذیل کر دیا جائے۔

"قرآن مجید کی رو سے، ایک عاقل، بالغ، مرد و عورت کا باہمی رضامندی سے ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ نکاح کہلاتا ہے۔ قرآن نے اسے مِيثَاقًا غَلِيظًا کہہ کر پکارا ہے۔ ($\frac{4}{21}$) اس باہمی رضامندی کے سلسلہ میں، مردوں کے متعلق کہا کہ: فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ ($\frac{4}{3}$) جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان میں سے نکاح کرو۔ اور عورتوں کے ضمن میں کہا کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا۔ ($\frac{4}{19}$) تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نکاح اُسی صورت میں ہو سکتا ہے جب مرد کے لئے "ماطاب" کی شرط پوری ہوتی ہو اور عورت کے

دل میں کراہت نہ ہو۔

اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ جب مرد کی طرف سے پسندیدگی نہ رہے، یا عورت کے دل میں کراہت پیدا ہو جائے تو نکاح باقی نہیں رہتا۔ اسی کو طلاق کہا جاتا ہے ــــ یعنی نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا۔

جہاں تک مردوں کا تعلق ہے، ہمارے مروّجہ قوانین کی رُو سے، ان کے سلسلہ میں کوئی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جب بھی محسوس کریں کہ (ما طاب) کی کیفیت باقی نہیں رہی، معاہدۂ نکاح فسخ کر سکتے ہیں۔ لیکن مقامِ صد تعجب ہے کہ قرآنِ مجید کی اس قدر کھلی ہوئی تعلیم کے باوجود، عورت کا یہ اختیار اور حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس کے راستے میں سو روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں، میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ اس سلسلہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق اور اختیار میں کسی قسم کی تمیز روا رکھنا، خلافِ قرآن اور خلافِ سنتِ رسول اللہؐ ہے۔

قرآن کی وہ آیت آپ نے دیکھ لی جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کے لئے معاہدۂ نکاح سے آزاد ہو جانے کے لئے شرط اتنی ہی ہے کہ اس کے دل میں خاوند کی طرف سے کراہت پیدا ہو جائے۔ حدیث میں، عورت کے حقِ طلاق کے سلسلہ میں، دو مشہور واقعات کا ذکر ہے اور یہ دونوں جناب ثابت رضؓ سے متعلق ہیں۔

(۱) عن ابن عباس ان جمیلة بنت سلول اتت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ما اعتب علی ثابت فی دین ولا خلق ولکن اکرہ الکفر فی الاسلام۔ لا اطیقه بغضا۔ فقال لها النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتردین حدیقته۔ قالت نعم۔ قال رسول اللہ علیہ وسلم۔ اقبل الحدیقة وطلقها تطلیقة۔ ؁۱

"جمیلہ بنت سلول نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے اپنے شوہر ثابتؓ سے دین یا کردار کی کوئی شکایت نہیں۔ لیکن میں اسلام میں آ جانے کے بعد پسند نہیں کرتی کہ کفر (کی کوئی حرکت سرزد ہو جائے) میں اپنی نفرت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم اس کا باغ واپس کرنے پر تیار ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے ثابت کو حکم دیا کہ باغ قبول کر لو اور اسے نکاح کے معاہدہ سے آزاد کر دو۔"

(۲) عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جدہ قال کانت حبیبة بنت سهل تحت ثابت بن قیس بن شماس وکان رجلا دمیما فقالت یا رسول اللہ لو لا مخافة اللہ اذا دخل علی لبصقت فی

؁۱ بخاری مع فتح الباری - جلد ۱۱ - صفحہ ۳۱۹

وجهه فقال رسول الله صلعم اتردين عليه حديقته فقالت نعم. قال فردت عليه حديقته ففرق بينهما رسول الله صلى الله عليه وسلم۔ ؎۱

جمیلہ بنت سہیل ثابت بن قیس بن شماس کی بیوی تھی، وہ بڑے پست قد اور بدشکل تھے۔ چنانچہ ان کی بیوی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خدا کی قسم اگر خوف خدا دامنگیر نہ ہوتا، تو جب وہ میرے پاس آیا تھا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اس کا باغ واپس کر دو گی۔ عرض کیا ہاں۔ چنانچہ اس نے انہیں ان کا باغ واپس کر دیا اور حضورؐ نے ان دونوں کے درمیان تفریق کرا دی۔

ان احادیث سے یہ باتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) حضور صلعم نے عورتوں کی شکایت ہی کو کافی سمجھا۔ خاوند سے کچھ بھی نہیں پوچھا گیا۔ یہاں تک کہ آپ نے یہ تک دریافت نہ کیا کہ: هَلْ اَنْتَ كَارِهُهَا كَمَا كَرِهَتْكَ اَمْ لَا ؎۲ کہ کیا تو بھی اسے ناپسند کرتا ہے جیسے وہ تجھے ناپسند کرتی ہے۔

(۲) عورتوں نے ناپسندی کی جو وجہ بیان کی ان کا کوئی مزید کھوج نہیں لگایا گیا۔ ان کا صرف بیان تسلیم کر لیا گیا۔

(۳) حضورؐ نے عورتوں کے اپنے فیصلہ کو نافذ کر دیا، انہیں کوئی اخلاقیات کا درس دینے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ان حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور صلعم کا یہ عمل، حکومت کی طرف سے ان عورتوں کے اپنے فیصلہ کا نفاذ تھا۔ اس سے یہ واضح ہے کہ عورت پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خاوند سے اپنی نفرت کے اسباب و وجوہ عدالت کے سامنے لائے اور عدالت اپنا اطمینان کرے کہ وہ وجوہات درست ہیں یا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ عدالت کا یہ کام ہے کہ وہ اس امر کی تسلی کرلے کہ عورت اس قسم کا بیان برضا و رغبت دے رہی ہے، کسی کے مجبور کرنے سے نہیں دے رہی۔ جہاں تک "باغ واپس دینے" کا تعلق ہے، اس کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر گفتگو کریں گے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مرد یا عورت ہنگامی طور پر اشتعال میں آکر، علیحدہ ہو جانے کا ارادہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے قرآن مجید نے تجویز کیا ہے کہ ایسی صورتوں میں، معاملہ مرد اور عورت تک محدود نہیں رکھنا چاہئے۔ کسی ثالث کا درمیان میں آکر، مصالحت کی کوشش

؎۱ سنن ابن ماجہ۔ جلد ۱۔ صفحہ ۶۶۳۔ ؎۲ فتح الباری شرح بخاری۔ جلد ۱۱۔ صفحہ ۳۲۰

کرنی چاہیئے۔ اس کے لئے اس نے کہا ہے کہ ایک نمائندہ عورت کے خاندان سے اور ایک خاوند کے خاندان سے مل کر، بورڈ کی شکل میں مصالحت کی کوشش کریں۔ (۴/۳۵) واضح رہے کہ اس بورڈ کا کام باہمی مصالحت کی کوشش ہوگی ــــ یہ مرد یا عورت کے فیصلہ پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوں گے۔ فیصلہ بہرحال، مرد یا عورت کا اپنا ہوگا۔ اور اگر یہ بورڈ اپنی مصالحت کی کوششوں میں ناکام رہ جائے، تو (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) مرد یا عورت کا فیصلہ نافذ ہو جائے گا۔ یہی طریق مسنون بھی ہے۔ چنانچہ الفقہ علی مذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۹۳ پر لکھا ہے۔

فاذا حدث بین الزوجین شقاق فمن السنۃ ان یتوسط بینھما من یستطیع التاثیر علیھما من اھلھما۔ فان عجزوا عن الاصلاح و اشتد الشقاق الی درجۃ یخشی معھا الخروج عن حدود اللہ تعالٰی فان فی ھذہ الحالۃ یصح المفارقۃ بعوض او بغیر عوض۔

اگر زوجین کے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو سنت طریقہ یہ ہے کہ ان کے خاندان سے ان پر اثر رکھنے والا کوئی شخص اس معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کرے۔ لیکن جب اصلاح کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں اور جھگڑا اس حد تک طول پکڑ جائے کہ حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خدشہ ہو تو پھر اس صورت میں زوجین کی جدائی ہی بہتر ہے چاہے وہ معاوضے کے بدلے میں ہو یا بغیر معاوضہ کے ہو۔

اب لیجئے "معاوضہ" کا سوال۔ نکاح کے وقت، مرد کی طرف سے عورت کو مہر دیا جاتا ہے۔ یہ تو فرض ہے۔ ہو سکتا ہے (اور عام معاشرہ کا رواج بھی ہے کہ) مہر کے علاوہ، عورت کو کچھ اور بھی دیا جائے۔ مرد، کو عورت کی طرف سے کچھ نہیں دیا جاتا۔ (جہیز تو محض ہماری رسم ہے۔)

اب ایسی صورت پیدا ہو سکتی تھی کہ عورت، اپنے حقِ طلاق کا غلط استعمال کر کے، نکاح کے دو چار روز بعد بنا بر کراہت، عقد سے آزاد ہو جانا چاہے۔ اس کی طرف سے اظہارِ کراہت کے بعد عدالت اُسے زبردستی اس کے خاوند کے نکاح میں تو نہیں رکھ سکتی۔ البتہ مرد نے جو کچھ عورت کو دیا تھا اسے (کلیتہً یا جزواً) واپس دلا سکتی ہے۔ (۲/۲۲۹)۔ رسول اللہؐ نے جو جناب ثابتؓ کے جو باغ واپس دلائے تھے تو وہ اسی ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ عدالت، کا فریضہ صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ متعین کرے کہ مرد کو کچھ معاوضہ ملنا چاہیئے یا نہیں۔ اور اگر ملنا چاہیئے تو کس قدر۔

اگر مرد خود معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنا چاہتا ہے تو پھر اُسے معاوضہ دلانے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ، قرآن کے الفاظ میں، وہ سونے کا ڈھیر ہی کیوں نہ ہو جو اس عورت کو دیا تھا۔ (۴/۲۰)

ایسی صورت بھی پیدا ہو سکتی تھی کہ مرد، اس معاہدہ کو توڑنا تو خود چاہے لیکن نیت یہ رکھے کہ اس کی تحریک عورت کی طرف سے ہو تاکہ وہ عدالت سے کچھ معاوضہ لے سکے۔ قرآن مجید نے اسے سختی سے روک دیا۔ اور کہہ دیا کہ تمہارے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کو تنگ کر کے روک رکھو تاکہ اس طرح تم ان سے معاوضہ حاصل کر سکو۔ (۴/۱۹)

البتہ عورت سے اگر کوئی بے حیائی کی بات سرزد ہو اور اس پر مرد، تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرے تو پھر عدالت اُسے کچھ معاوضہ دلا سکتی ہے۔ (۴/۱۹)

قرآن مجید میں، مرد یا عورت کی طرف سے تنسیخ نکاح کی تحریک کے لئے الگ الگ الفاظ استعمال نہیں کئے گئے لیکن فقہ نے ان کے لئے الگ الگ اصطلاحات وضع کیں۔ چنانچہ کہا یہ گیا ہے کہ:۔

الخلع نوع من الطلاق۔ لان الطلاق تارة یکون بدون عوض وتارة بعوض۔ والثانی هو الخلع۔

خلع طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ بعض اوقات طلاق بغیر کسی معاوضہ کے ہوتی ہے اور کبھی معاوضہ کے عوض۔ اور یہ دوسری قسم خلع کہلاتی ہے۔[1]

خلع کی الگ اصطلاح تو یوں وضع ہوئی لیکن اس کے بعد، جب ہمارے فقہی قوانین مرتب ہوئے تو ان میں مرد کو تو بغیر کسی قسم کی شرائط اور پابندیوں کے، جب جی چاہے، معاہدۂ نکاح فسخ کرنے کا حق دے دیا گیا اور عورت بیچاری کے حقِ خلع پر ایسی سخت پابندیاں عائد کی گئیں جن کی رُو سے وہ ان زنجیروں میں جکڑی ہوئی رہ گئی جن کا ذکر، طلوعِ اسلام نے، انتہائی درد و سوز کے ساتھ اپنے باب المراسلات (اشاعت شدہ ماہ ستمبر ۱۹۶۸ء) میں کیا ہے۔ کہیں یہ کہا گیا ہے کہ طلاق (یعنی معاہدۂ نکاح کی تنسیخ) کا حق تو مرد (اور صرف مرد) کو حاصل ہے۔ ہاں، وہ اگر چاہے تو اپنے اس حق کو، بیوی کو بھی تفویض کر سکتا ہے۔

کیا آپ نے کبھی اس قسم کے معاہدہ کا نام بھی سنا ہے کہ اسے استوار کرنے کے لئے تو فریقین میں سے ہر ایک کی رضامندی کی ضرورت ہو، لیکن اُسے فسخ کرنے کا کلیتہً حق ایک فریق کو حاصل ہو اور دوسرا فریق اسے فسخ ہی نہ کر سکے۔

پھر، مرد تو جب جی چاہے، عدالت کی مداخلت کے بغیر، از خود، اس معاہدہ کو (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ کر توڑ دے۔ لیکن اگر عورت اسے فسخ کرانا چاہے تو اُسے عدالت کی طرف رجوع کرنا پڑے اور وہ بھی ایسی کڑی شرطوں کے ساتھ جن کا پورا کرنا اس بیچاری کے لئے از بس دشوار ہو۔

آپ سوچئے کہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام میں، کہیں بھی، مرد اور عورت کے ان اختیارات میں کسی قسم کی تفریق کی گئی ہے؟ اس امتیاز سے، صورت کیا پیدا ہو گئی ہے، اس کے متعلق ہم سے نہیں،

۱۔ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۳۹۳۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی زبان سے سنیئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

اس افسوسناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم ۵، فیصدی گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصہ کی زندگیاں تلخ بلکہ تباہ و برباد کر دی ہیں۔[1]

عورت کے حقِ طلاق کو عملاً سلب کر لینے کے متعلق آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانونِ اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا ہے اور اصولِ شرع کے خلاف خلع دینے یا نہ دینے کو بالکل مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھہرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسولؐ کے قانون پر قطعاً نہیں۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہو گئی ہیں، بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے۔[2]

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

پس نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لئے محض اس بات کا تحقیق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو قطعی ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔[3]

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔

حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں اور یہ ایک معقول بات ہے۔[4]

آگے چل کر اس قاعدہ کی مزید تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی کے لئے تنقیح طلب ہے ہی نہیں کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالبِ خلع ہے۔ یا محض نفسانی خواہشات کے لئے علیحدگی چاہتی ہے۔ اس لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے قاضی ہونے کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ

---

[1] حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۹۔ [2] حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۷۳-۷۴۔

[3] " " " " ۶۵۔ [4] " " " " " ۷۰۔

اوّل تو اس سوال کی کما حقہٗ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق؛ عورت کے لئے اس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوافیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حقِ طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوافیت کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے عورت کے حقِ خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیئے۔[1]

مقامِ حیرت ہے کہ یہ حضرات ایک طرف تو عورت کے حقوق کی مدافعت میں اس قدر دل گرفتہ نظر آتے ہیں اور غیر اسلامی قوانین شریعت کی تبدیلی کے لئے اس قدر مضطرب دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں ذرا سی سلسلہ جنبانی (عائلی قوانین کی صورت میں) ہوتی ہے تو حکومت کے اس مستحسن اقدام کی سب سے زیادہ مخالفت انہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ سیاست کے چکر بھی دنیا میں عجیب عجیب تماشے دکھاتے ہیں۔ ان کی اسی مخالفت کا نتیجہ تھا کہ عائلی قوانین میں بھی اس مظلوم طبقہ کی داد رسی کے لئے کچھ نہ ہو سکا۔

بہرحال، اب کرنے کا کام یہ ہے کہ جو حضرات اسلام اور انسانیت کے نام پر عورت کے ساتھ اس ناانصافی کو محسوس کرتے ہیں، وہ آگے اس کے جائز قرآنی حقوق دلانے کے لئے جدوجہد کریں۔ اس باب میں طلوعِ اسلام مستحقِ مبارکباد ہے کہ اس نے شروع ہی سے اس بے سہارا طبقہ کی غمگساری اور ہمدردی میں خون کے آنسو بہائے ہیں اور اب پھر اسی جذبہ کو لے کر اس سوال کو سامنے لایا ہے۔ ضرورت ہے کہ طلوعِ اسلام کی اس جدوجہد میں اس سے پورا پورا تعاون کیا جائے۔ کرنے کا کام صرف اتنا ہے کہ ہمارے مروّجہ غیر اسلامی قوانین میں قرآن اور سنت کے مطابق ترمیم کی جائے جس کی رُو سے واضح الفاظ میں طے پا جائے کہ:

(۱) معاہدۂ نکاح کے فسخ کرنے کا عورت کو اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو۔ جس طرح اپنے نکاح کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق مرد کو حاصل ہے، اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس معاہدہ کے فسخ کرنے کا فیصلہ عورت کو از خود کر لینا چاہیئے۔ اس میں عدالت کی مداخلت کی ضرورت نہیں۔

(۲) ثالثی بورڈ صرف مصالحت کی کوشش کرے۔ یا اس امر کا اطمینان کرے کہ عورت نے برضا و رغبت فسخِ نکاح کا فیصلہ کیا ہے۔ اسے، یا کسی اور ادارہ کو اس کا قطعاً حق حاصل نہ ہو کہ وہ فیصلہ کرے کہ عورت کے دل میں واقعی خاوند کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ جن امور کا تعلق انسان کے قلب سے ہو، اس کا فیصلہ کوئی دوسرا شخص کس طرح کر سکتا ہے۔

---

[1] حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۷۰۔

(۳) عورت کے اس فیصلہ کے بعد، ثالثی بورڈ یا عدالت صرف یہ فیصلہ کرے کہ مرد کو کچھ معاوضہ دلایا جائے اور اگر دلایا جائے تو کس قدر۔ اس بات کا، عورت کے فسخِ نکاح کے فیصلہ پر کوئی اثر نہ ہو۔

اس قسم کا قانون، خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے عین مطابق ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ چیز سلفِ صالحین میں سے بھی اکثر کے مسلک کے مطابق ہوگی۔ اس سلسلہ میں قاضی ابوبکر جصاص لکھتے ہیں:

قال ابو حنیفۃ و ابو یوسف و محمد و زفر و مالک والحسن بن صالح، والشافعی، یجوز الخلع بغیر سلطان و روی مثلہ عن عمر و عثمان و ابن عمر رضی اللہ عنھم[1]

امام ابوحنیفہ۔ امام ابو یوسف۔ امام محمد۔ امام زفر۔ امام مالک۔ حسن بن صالح اور امام شافعی کے نزدیک، خلع حکومت کی مداخلت کے بغیر جائز ہے۔ اور یہی مسلک حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی روایت کیا گیا ہے۔

بعض فقہا نے اس میں عقد المصالحت، ثالثی بورڈ کی مداخلت کی بھی شرط عائد کی ہے۔ انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ وھل للحکمین الحق فی التطلیق اذا قتضت المصلحۃ۔ یعنی اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو کیا حکمین کو معاہدۂ نکاح فسخ کرنے کا حق ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔ الجواب۔ نعم۔ اس کا جواب ہاں میں ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ۴۔ صفحہ ۴۹۴) لیکن ہمارے نزدیک اس سے یہی مفہوم ہو سکتا ہے کہ مرد یا عورت کی طرف سے فسخِ نکاح کے فیصلہ کا نفاذ، ثالثی بورڈ کی مصالحانہ کوشش کی ناکامی کے بعد، کیا جائے۔ یہ نہیں کہ ثالثی بورڈ اس امر کا فیصلہ کرے کہ معاہدہ منسوخ ہونا چاہیئے یا نہ۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی رُو سے، ثالثی بورڈ کا فریضہ صرف زوجین کی مصالحت کے لئے کوشش کرنا ہے، نہ کہ یہ فیصلہ کرنا کہ معاہدۂ نکاح منسوخ کیا جائے یا نہ۔ اس کا فیصلہ مرد یا عورت کی طرف سے ہوگا اور اس فیصلہ کو کوئی مسترد نہیں کر سکے گا۔ مرد کی طرف سے طلاق کے لئے یہی صورت اس وقت بھی ہے۔ اس کا حقِ طلاق، حکمین کی مرضی پر موقوف نہیں۔ یہی شکل عورت کے لئے بھی ہونی چاہیئے۔

جب تک اس قسم کا قانون مرتب نہیں ہوتا، عورتوں کے مصائب کا حل نہیں مل سکتا۔ اس وقت سینکڑوں گھرانے محض اس قسم کے قانون کے نہ ہونے کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔

کیا ہم توقع کریں کہ ملک کا اسلام دوست، انصاف پرور، دردمند طبقہ اس قسم کا قانون مرتب کرانے کے لئے کوشش کرے گا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت اور دنیا کے سامنے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پیش کرنے کی قابلِ قدر کوشش ہوگی۔"

یہ وضاحت ۱۹۶۸ء میں کی گئی تھی۔ اس کی روشنی میں ہم، حقوقِ نسواں کمیٹی سے درخواست کریں گے

---

[1] احکام القرآن۔ جلد ۲۔ صفحہ ۲۳۵۔

کہ وہ اپنی سفارش کے اس حصّہ پر نظرِثانی کرے اور اس میں اس طرح ترمیم کر دے کہ:-

طلاق کا حق مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں ہوگا اور اس کا طریق کار بھی دونوں کے لئے ایک ہی۔ البتہ عورت کی طرف سے طلاق کی صورت میں عدالت مجاز اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ فسخ نکاح سے مرد کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔ اگر اس کا احتمال ہو تو عدالت متعین کرے گی کہ اس کے لئے عورت کی طرف سے مرد کو کیا معاوضہ دلایا جائے۔

واضح رہے کہ سفارشات میں یہ کہا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں، مرد پر لازم ہوگا کہ وہ مہر اور جہیز عورت کو واپس کرے۔

ایک اور نقص

۱۹۶۱ء کے قوانین میں کہا گیا تھا کہ مصالحت کی کوشش کے ناکام رہ جانے کی صورت میں طلاق، نوٹس کی تاریخ کے (۹۰) دن یا وضع حمل کے بعد، (جو بھی بعد میں واقع ہو) نافذ ہوگی۔ اس کمیٹی کی سفارشات میں بھی اسی کو دہرایا گیا ہے، جس سے واضح ہے کہ جس طرح ۱۹۶۱ء کے واضعین قانون "نوّے دن (تین ماہ) یا وضع حمل" کی قرآنی شرط کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے تھے، اسی طرح موجودہ کمیٹی بھی اسے نہیں سمجھ سکی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ان حضرات کے ذہن میں عدت کا تصوّر تو ہے لیکن عدت کا قرآنی مفہوم ان کے ذہن میں نہیں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ طلاق (یعنی فسخ نکاح) کے اتنے عرصہ بعد تک مطلقہ عورت کسی نئے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس مدت کو عدت کہتے ہیں، جو عام طور پر تین ماہ یا وضع حمل تک کا عرصہ ہوتی ہے۔ (اس کی تفصیل قرآنِ کریم میں موجود ہے) ہم اس کمیٹی سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنی سفارش میں حسبِ ذیل خطوط پر ترمیم کرلے تاکہ مجوزہ قانون قرآنِ کریم کے مطابق ہو جائے۔

مصالحت کی کوشش کے ناکام رہ جانے کی صورت میں (جس کے لئے مدت کا تعین ضروری ہوگا) عدالت مجاز طلاق کا اعلان کر دے۔ اس اعلان کی تاریخ سے طلاق نافذ ہو جائے گی، اور اس کے بعد عدت شروع ہو جائے گی۔

ان سفارشات میں، بہت سے قانونی نقائص کی بھی نشان دہی کی گئی ہے اور عورت کی کفالت کے سلسلہ میں بھی اطمینان بخش سفارشات موجود ہیں۔ لیکن "نکاح، طلاق" سے متعلق یہی اہم سفارش ہے۔ (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی عورت کے لئے یکساں حقِ طلاق) اس کے لئے اور عورتوں کے عام حقوق کے تحفظ کے سلسلہ میں جو سفارشات کی گئی ہیں ان کیلئے ہم ارباب کمیٹی کو مستحقِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ اس میں تعدد ازدواج (POLYGAMY) کے متعلق بھی کوئی سفارش سامنے آ

آجاتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا —— ممکن ہے (اور اسی قسم کی دیگر سفارشات) رپورٹ کے اگلے حصہ میں درج ہوں۔

ہم کمیٹی کو یہ مشورہ بھی دیں گے کہ وہ حکومت سے کہے کہ ان کی سفارشات کو قبول کر لینے کے بعد، وہ مجوزہ قوانین کا مسودہ بغرض تنقید و تبصرہ اخبارات میں شائع کر دے، اور اس باب میں قدامت پرست طبقہ کی غوغا آرائی سے قطعاً مرعوب نہ ہو —— ہمارے معاشرے میں عورت بڑی مظلومیت کی زندگی بسر کرتی ہے اور اس کی داد رسی، حکومت کا اوّلین فریضہ ہے۔ اللہ اسے اس فریضہ کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

اعلان برائے پیشگی کھاتہ داران

"معراج انسانیت" کا تازہ ایڈیشن (۱۹۷۶ء) چھپ چکا ہے جس کا اعلان گزشتہ اور حالیہ شمارے میں مسلسل آ رہا ہے۔ پیشگی کھاتہ داران کو یہ کتاب حسب معمول ارسال کی جائے گی۔ جن کھاتہ داران کو اس کتاب کی ضرورت نہ ہو براہ کرم ۲۰ ستمبر ۱۹۷۶ء تک ادارہ ہذا کو اپنے فیصلے سے مطلع فرمادیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

United PTI 5/73

ارشادِ خداوندی ہے

تمہارے لئے رسول اللہؐ کی زندگی

بہترین نمونہ (ماڈل) ہے

- خدا نے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں خط و خال کو قرآنِ مجید میں محفوظ کر دیا تاکہ وہ تمام نوعِ انسان کے لئے "قیامت تک" ماڈل کا کام دے۔
- لہٰذا حضورؐ کی وہی سیرت قابلِ اعتماد اور یقینی ہوگی جو قرآنِ مجید کی تفصیل کے مطابق ہو۔
- پرویز صاحب، نے عمر بھر کے تدبرِ قرآن کے بعد، ایسی سیرت مرتب کر دی۔ یہ ان کے عشق اور خرد کا قابلِ رشک آمیزہ ہے۔
- انداز اس کا یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی آیت زیبِ عنوان ہے اور اس کے تابع ان واقعات اور احادیث کو ترتیب دیا گیا ہے جو قرآنی اصول کے مطابق ہیں۔
- نتیجہ اس کا یہ کہ اس سے قرآنِ مجید کے سانچے میں ڈھلی ہوئی نورانی سیرتِ طیبہ وجہ فروغِ دیدہ ہو جاتی ہے۔
- اس سیرت سے، معاندینِ اسلام کے ان اعتراضات کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ جو وہ وضعی روایات پر مبنی کتبِ سیرت کی رو سے کیا کرتے ہیں۔
- اس سیرتِ مقدسہ کو ہم ساری دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں کہ تاریخِ عالم سے اس پیکرِ حسن و رعنائی کی مثال لا کر دکھاؤ!
- یہ سیرتِ طیبہ

معراجِ انسانیّت

کے نام سے تیسرے (تازہ) ایڈیشن میں شائع ہوئی ہے۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ کتابت۔ طباعت۔ نہایت روشن۔ گرد پوش پُرکشش۔ بڑی تقطیع۔ ضخامت ۷۰۰ صفحات۔ قیمت مجلد ۲۵ روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مکتبۂ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

قرآنِ مجید

کی زبان عربی ہے۔

اس لئے اسے سمجھنے کے لئے عربی زبان کا جاننا اشد ضروری ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے پرانے طریقِ تعلیم نے عربی زبان کو ہوّا بنا رکھا تھا۔ پروفیسر رفیع اللہ صاحب نے اپنے علمی تجربہ کی بنا پر، ایک ایسا سائنٹیفک طریق وضع کیا جس سے یہ زبان، قلیل سے عرصہ میں، نہایت آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی یہ مقبولِ عام کتاب ہے۔

عربی خود سیکھئے

اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس سے آپ گھر بیٹھے، استاد کی مدد کے بغیر، عربی زبان سیکھ سکتے ہیں۔

قیمت جدید ایڈیشن -/۱۰ روپے (علاوہ محصولڈاک)

—(۰)—

جی نہیں!

اس باب میں قرآن کا یہ حکم نہیں!

جب آپ کو کوئی یہ بات کہہ دیتا ہے تو آپ خاموش ہو جاتے ہیں اس لئے کہ آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ میں قرآن کا حکم کیا ہے اور ہم کیا کرتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، قربانی، ترکہ، وصیت، نکاح، طلاق، اوقات، شراب، جوا، حرام و حلال، یا مثلاً شب برات، عید میلاد، قرآن کی حفاظت، ناسخ و منسوخ، تصویر کشی، موسیقی، انبیاءؑ، مشاعرے، عذابِ قبر، حیات بعد الممات، قومی ملکیت، آدم، نبی اکرمؐ اور علمِ غیب، حضورؐ کا معراج، وحی اور الہام، تاریخ اور قرآن، مرکزِ ملت، غلام اور لونڈیاں وغیرہ، بیسیوں باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کو علم نہیں کہ قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن آپ گھبراتے کیوں ہیں کہ آپ کو ان کا علم نہیں۔ یہ سب کچھ ایک ہی جگہ —

قرآنی فیصلے

میں مل جائے گا۔ جس کی جلد دوم، جلد سوم، ایک عرصہ سے نایاب تھیں۔ اب ان دونوں جلدوں کے جدید ایڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔

قیمت جلد دوم (جدید ایڈیشن) -/۱۰ روپے (علاوہ محصولڈاک)
قیمت جلد سوم (جدید ایڈیشن) -/۱۰ روپے (علاوہ محصولڈاک)
جلد اوّل -/۵ روپے

ملنے کا پتہ

۱۔ ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور

۲۔ مکتبۂ دین و دانش - چوک اردو بازار - لاہور